بسم اللہ الرحمن الرحیم

ماہنامہ الرسالہ

جنوری 2004

خصوصی شمارہ : کوریا کا سفر

کوریا کا سفر

امریکا میں قائم شدہ ایک مشہور تنظیم ہے، جس کا پورا نام یہ ہے
Interreligious and International Federation for World Peace

اس تنظیم نے سول (Seoul) میں ایک انٹرنیشنل کانفرنس کی۔ اس کانفرنس کا موضوع یہ تھا:
The world at a turning point: Innovative approaches to peace through responsible leadership and good governance.

اس کانفرنس کی دعوت پر جنوبی کوریا کا سفر ہوا۔ یہاں اس کی مختصر روداد درج کی جاتی ہے۔

19 اگست کی شام کو 9 بجے ائرپورٹ کے لیے روانگی ہوئی۔ راستے میں کوئی قابلِ ذکر بات سامنے نہیں آئی، سوائے اس کے کہ راستہ کاروں سے بھرا ہوا تھا۔ شہر کی سڑکوں پر کاروں کی یہ بھرمار اس لیے نہیں ہے کہ لوگوں کی قوتِ خرید بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ یہ کارلون (Car Loan) کا کرشمہ ہے۔ بینکوں نے سودی قرضے پر کار خریدنے کی آسانی اتنی زیادہ بڑھادی ہے کہ اب تقریباً ہر شخص کار خرید سکتا ہے، خواہ کارلون اور ہاؤس لون کے بوجھ میں وہ ساری زندگی دبا رہے۔

دہلی ائرپورٹ پر ڈاکٹر اوصاف علی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان کی عمر 70 سال ہو چکی ہے۔ وہ حکیم عبدالحمید صاحب (وفات 1999) کے ساتھ 45 سال تک رہے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ آخری زمانے میں جب حکیم صاحب صاحبِ فراش ہو گئے تھے، اور مشکل سے بولتے تھے۔ ایک دن انہوں نے ہلکی آواز میں کہا کہ الرسالہ بھیجو۔ ڈاکٹر اوصاف علی صاحب نے سمجھا کہ وہ پڑھنے کے لیے کوئی میگزین مانگ رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اردو کے کچھ میگزین بھیج دیے۔ ان کو دیکھ کر حکیم صاحب غصہ ہو گئے۔ انہوں نے ان رسالوں کو کنارے رکھ دیا، اور ایک کاغذ پر لکھ کر دیا کہ یہ لے آؤ۔ اس کاغذ پر الرسالہ لکھا ہوا تھا۔ اس کے بعد ڈاکٹر اوصاف علی صاحب نے انہیں ماہنامہ الرسالہ بھجوایا۔ اس کو پاکر وہ بہت خوش ہوئے اور دیر تک اس کو پڑھتے رہے۔ اصل یہ ہے کہ حکیم عبدالحمید صاحب بالکل شروع سے الرسالہ کے ریگولر قاری تھے۔ ہر مہینے کا شمارہ حاصل کرکے وہ پابندی کے ساتھ اس کو پڑھتے تھے۔

ڈاکٹر اوصاف علی صاحب نے بتایا کہ حکیم عبدالحمید صاحب کے اندر کافی مزاح (Humour) تھا۔ چنانچہ ان کی مجلس خشک مجلس نہیں ہوتی تھی۔ ڈاکٹر اوصاف علی صاحب نے بتایا کہ ایک بار کچھ لوگ حکیم صاحب سے ملنے کے لیے آئے۔ میں نے چائے بنوائی تو اس میں حکیم صاحب کی چائے موجود نہ تھی۔ آنے والوں نے پوچھا کہ آپ چائے کیوں نہیں لے رہے ہیں۔ حکیم صاحب نے کہا کہ میں چائے نہیں پیتا۔ انہوں نے کہا کہ مجھے چائے سے ڈر لگتا ہے۔ لوگوں نے پوچھا کہ کیوں؟ انہوں نے کہا کہ 1939 میں میں شملہ میں تھا۔ شملہ میں کافی سردی تھی۔ لوگوں کے کہنے پر میں نے ایک پیالی چائے لے کر پینا شروع کیا۔ اچانک ریڈیو پر خبر آئی کہ دوسری عالمی جنگ چھڑ گئی ہے۔ اس کے بعد پھر میں نے کبھی چائے نہیں پی۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں چائے کی پیالی اپنے ہاتھ میں لوں، اور پھر تیسری عالمی جنگ چھڑ جائے۔

ڈاکٹر اوصاف علی صاحب نے سید بدرالدجیٰ کی تقریر سنی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ غیر معمولی صلاحیت کے مقرر تھے۔ مگر ان کی سوچ پر منفی ذہنیت غالب تھی۔ ایک مرتبہ انہوں نے ہندوستانی پارلیمنٹ میں ایک تقریر کی۔ یہ تقریر ہندو فرقہ واریت کے خلاف احتجاج تھی۔ ان کی اس تقریر کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ خود نہرو نے اس پر تالی بجائی۔

سفر میں ایک جرمن خاتون مسز ارسولا میک لیکلینڈ (Ursula Mclackland) ہمارے ساتھ تھیں۔ وہ کانفرنس میں شرکت کے لیے جا رہی تھیں۔ وہ 15 سال سے دلی میں رہ رہی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ جرمنی میں بیشتر لوگ مذہب سے دلچسپی نہیں رکھتے۔ اس لیے ان کا دل جرمنی میں نہیں لگتا۔ وہ ایک مذہبی خاتون ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ خدا کا عقیدہ ہی زندگی کو بامعنی (meaningful) بناتا ہے:

It is belief in God that makes life meaningful.

دہلی سے تھائی ائرویز کی فلائٹ کے ذریعے روانگی ہوئی۔ یہ ایک بڑا جہاز تھا جس میں 360 سیٹیں تھیں۔ وہ دہلی سے سوا بارہ بجے رات کو روانہ ہوا۔ گھر سے روانگی 19 اگست کی شام کو ہوئی تھی،

لیکن جب دہلی سے جہاز روانہ ہوا تو اگست کی 10 تاریخ ہو چکی تھی۔ پرواز کے دوران تھائی ائرویز کا فلائٹ میگزین سواسدی (Sawasdi) کا شمارہ اگست 2003 دیکھا۔ اس میں ایک مضمون لباس اور ٹیلرنگ کے بارے میں تھا۔ موجودہ زمانے میں کپڑے اور لباس کے بارے میں ایک نیا نظریہ بنا ہے۔ اس میں تھائی لینڈ کے مشہور ترین انٹرنیشنل ٹیلر نیری (Narry) کے بارے میں بتایا گیا تھا۔ اس نے اب تک 20لاکھ لوگوں کے لیے ان کی پسند کے کپڑے تیار کیے ہیں۔

London office Tel: 442077954778, Mobile:++6618347545

اس ٹیلر کی اس ممتاز کامیابی کا راز یہ ہے کہ اس نے اپنے فن میں غیر معمولی کمال پیدا کیا۔ اس کے اشتہار میں اس کی طرف سے یہ الفاظ تھے: ہم تمام ناپ (measurement) کو کمپیوٹر میں فیڈ (feed) کرتے ہیں تاکہ آئندہ فون، فیکس یا ای میل سے آرڈر دیا جا سکے۔ ہم 10 زبانیں بولتے ہیں، تھائی، انگلش، جرمن، انڈین، اسپینش اٹیلین، ناروین، ڈینش، فنش، سوئڈش:

We speak 10 language: Thai, English, German, Indian, Spanish, Italian, Norwegian, Danish, Finnish, Swedish.

ہم ہر ایک کو اس کی اپنی ذات کی نسبت سے خدمات فراہم کرتے ہیں:

we offer personalized tailoring services

اس کو پڑھ کر مجھے خیال آیا کہ دعوت کا طریقہ بھی عین یہی ہے۔ مجموعہ کو خطاب کرنے سے دعوت کا حق ادا نہیں ہوتا۔ دعوت کا مؤثر طریقہ یہ ہے کہ انفرادی خطاب کا اصول اختیار کیا جائے۔ ہر ایک کے اپنے مزاج کے مطابق، اس کے ذہن کو ایڈریس کیا جائے۔ افراد کے اندر گہری تبدیلی اسی شخصی تخاطب کے ذریعے آسکتی ہے۔ بڑے بڑے جلسوں میں کی جانے والی تقریریں فرد کے ذہن کو ایڈریس نہیں کرتیں۔ اس لیے اس قسم کے مجموعی خطاب سے حقیقی معنوں میں ذہنی انقلاب بھی نہیں آتا۔

بینکاک کے انگریزی اخبار دی نیشن (The Nation) کا شمارہ 16 اگست 2003 دیکھا۔ اس کے ضمیمہ میں ایک باتصویر رپورٹ چھپی تھی۔ اس کا عنوان یہ تھا:

Travelling in Thailand a daunting prospect for wheelchair-bound tourists.

اس میں بتایا گیا تھا کہ موجودہ زمانے میں معذور مسافر (disabled travellers) کثرت سے مختلف ملکوں میں جانے لگے ہیں۔ امریکا میں معذور مسافروں کی تعداد سالانہ تقریباً پچاس ملین ہوتی ہے جس سے امریکا کو زبردست مالی فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح جاپان میں، خاص طور پر ٹوکیو میں معذور مسافروں کی سہولت کا خصوصی انتظام کیا گیا ہے۔ مگر تھائی لینڈ جیسے ملکوں میں ایسے مسافروں کے لیے کوئی سہولت نہیں جو وہیل چیئر پر وہاں پہنچتے ہیں۔ تھائی لینڈ کے ہوٹلوں میں وہیل چیئر پر نقل وحرکت سخت مشکل کام ہے۔

عالمی اسفار میں معذور لوگوں کی شمولیت ایک نیا تاریخی ظاہرہ ہے۔ یہ جدید ذرائع سفر کی بنا پر ممکن ہوا ہے۔ قرآن میں دو جگہ یہ تعلیم دی گئی ہے کہ تمہارے مال میں محروم کا بھی حصہ ہونا چاہیے۔ مگر قدیم زمانے میں محروم کا مطلب صرف رزق سے محروم ہونا سمجھا جاتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے توسیع مفہوم میں معذور لوگ بھی شامل ہیں۔ موجودہ زمانے میں معذور لوگوں کے لیے غیر معمولی سفری انتظامات کیے گئے ہیں۔ اس بنا پر معذور کے لیے سفر کرنا تقریباً اتنا ہی آسان ہو گیا ہے، جتنا کہ غیر معذور کے لیے سفر کرنا۔ مثلاً ہر جگہ معذور کے لیے عمدہ وہیل چیئر کا انتظام رہتا ہے، جس کا کوئی تصور قدیم زمانے میں نہ تھا۔

دہلی سے بینکاک کا سفر تقریبا چار گھنٹے میں طے ہوا۔ بینکاک ائر پورٹ پر ہمارا جہاز اترا تو 10 اگست کی صبح کا سورج طلوع ہونے والا تھا۔ یہاں ائر پورٹ پر فجر کی نماز ادا کی۔ بینکاک ائر پورٹ ایک خوبصورت اور منظم ائر پورٹ ہے۔ وہ ایک تعمیری گلدستہ نظر آتا ہے۔ اس کے ٹائلٹ تک نہایت مرصع تھے۔ ائر پورٹ کی بیرونی دیواروں پر بہت بڑے بڑے شیشے لگے ہوئے تھے۔ اس کے باہر فطرت کی حسین دنیا تھی۔ میں ایک پرسکون گوشے میں کھڑا ہوا، اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ میرے دل سے نکلا — ”خدایا، تو نے دنیا کی وقتی جنت کی جھلک دکھا دی۔ اب تو آخرت کی ابدی جنت کو میرے لیے مقدر کر دے“۔

بینکاک ائر پورٹ پر ایک ہندوستانی مسافر سے بات کرتے ہوئے میں نے پوچھا کہ یہ

ائر پورٹ آپ کو کیسا لگتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ بہت اچھا۔ میں نے کہا کہ دلی ائر پورٹ اور بینکاک کے ایر پورٹ میں کیا فرق ہے۔ انہوں نے کہا کہ زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ ہمارا دیش اگر انڈر ڈولپڈ (underdeveloped) ہے، تو یہ دیش اوور ڈولپڈ (overdeveloped) ہے۔

بینکاک (Bangkok) تھائی لینڈ کی راجدھانی ہے، اور یہاں کی سب سے بڑی بندرگاہ ہے۔ بینکاک کے بیچ میں ایک دریا ہے، جس کے دونوں طرف شہر آباد ہے۔ دونوں حصوں کو بہت سے پلوں کے ذریعہ جوڑ دیا گیا ہے۔ بینکاک میں پوسٹ اور ٹیلی گراف کا نظام 1880 میں بنایا گیا۔ یہاں کی سڑک پر الکٹرک ٹرام 1892 میں چلائی گئی۔ اسٹیٹ ریلوے کی پہلی لائن 1900 میں تعمیر کی گئی۔ نو آبادیاتی دور میں بنے ہوئے وہ پل اور بلڈنگیں اب بھی یہاں دکھائی دیتی ہیں، جو فرانس اور اٹلی کے طرزِ تعمیر پر بنائی گئی تھیں۔ یہاں پہلی یونیورسٹی 1916 میں بنائی گئی۔ سیکنڈ ورلڈ وار کے بعد بینکاک میں تعمیر وترقی کا کام بہت زیادہ تیز رفتاری سے شروع ہوا۔

نئے بینکاک کی آبادی بہت بڑھ گئی ہے۔ وہاں بہت زیادہ سڑکیں اور بلڈنگیں بنائی گئی ہیں، مگر بینکاک اب بھی منصوبہ بند شہر (Planned city) کی حیثیت نہیں رکھتا۔ پہلے یہاں سفر زیادہ تر کشتیوں کے ذریعے ہوتا تھا۔ اب یہاں کی سڑکوں پر زرق برق کاریں دوڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ بینکاک کا ایر پورٹ ساؤتھ ایسٹ ایشیا کا سب سے بڑا ایر پورٹ سمجھا جاتا ہے۔ بینکاک میں ایک تعداد مسلمانوں کی بھی ہے۔ وہ زیادہ تر یہاں کی مسجد کے آس پاس آباد ہیں۔

بینکاک سے سول کے لیے تھائی ائرویز کی فلائٹ نمبر TG634 سے روانگی ہوئی۔ 10 اگست کا سورج بلند ہو چکا تھا۔ اس کی سنہری کرنیں فضا کو چاروں طرف روشن کر رہی تھیں۔ جہاز اگر انسانی انجینئرنگ کا نمونہ دکھا رہا تھا، تو اس کے باہر کی دنیا فطرت کی عظیم تر انجینئرنگ کا تعارف بنی ہوئی تھی۔ یہ ماحول تھا جس میں بینکاک سے ہمارا سفر شروع ہوا۔

پرواز کے دوران انگریزی اخبار دی سنڈے نیشن (The Sunday Nation) کا شمارہ

دیکھا۔ اس کو تھائی لینڈ کا انڈپنڈنٹ اخبار کہا جاتا ہے۔ اس کا آخری صفحہ اسپورٹس کے بارے میں تھا۔ اس پر ایک پانچ کالمی تصویر بنی ہوئی تھی۔ اس میں ریل میڈرڈ (Real Madrid) کے ایک درجن کھلاڑیوں کی ایک ٹیم بینکاک کی تھائی نیشنل ٹیم سے کھیلنے کے لیے یہاں پہنچی تھی۔ اس رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ اسپین کے ایک کھلاڑی نے اپنے احساس کا اظہار کرتے ہوئے کہا— یہ ایک اچھا تجربہ ہے اس لیے کہ ہم اپنے سے مختلف ایشیائی ٹیم سے مل کر نئے طریقے سیکھیں گے:

This is a good experience as we got to learn new tactics from asian teams which are different from Europe.

فرق واختلاف کوئی مسئلہ نہیں بلکہ اس کو آپ اپنی ترقی کا ذریعہ بنا سکتے ہیں۔

ڈاکٹر اوصاف علی صاحب کثرت سے کانفرنسوں میں شریک ہوتے رہے ہیں۔ ان سے میں نے پوچھا کہ کانفرنسوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ انہوں نے کہا کہ ایک امریکی پروفیسر نے کہا ہے کہ ان کانفرنسوں پر جتنی زیادہ رقم خرچ ہوتی ہے، اس سے اچھا تو یہ ہے کہ شریک ہونے والے اپنا مقالہ لکھ کر ہمیں بھیج دیں، اور ہم تحریری صورت میں اس کا جواب روانہ کر دیں۔

انہوں نے کہا کہ دوسری طرف امریکی یونیورسٹیوں کا معاملہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک ہر پروفیسر کو دو سال میں کم از کم ایک بار یونیورسٹی کے خرچ پر اپنی اسٹڈی کے ایریا میں جانا چاہیے، اور کانفرنس میں حصہ لینا چاہیے۔ جو پروفیسر ایسا نہ کر سکے اس کی حیثیت یونیورسٹی میں علمی اعتبار سے گھٹ جاتی ہے۔ یہ سمجھا جانے لگتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپ ڈیٹ (update) نہیں کر رہا ہے اور اپنے سبجکٹ سے آؤٹ آف ٹچ (out of touch) ہو گیا ہے۔

سکھ لیڈر سردار منجیت سنگھ بھی اسی جہاز میں سفر کر رہے تھے۔ ان سے میں نے کہا کہ مسلم شاعر اقبال نے گرونانک کے بارے میں کہا تھا کہ ”ہند کو اک مرد کامل نے جگایا خواب سے“۔ اس سلسلے میں ان کا ایک اور شعر یہ ہے:

نانک نے جس چمن مین وحدت کا گیت گایا ‏ ‏ ‏ ‏ میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

میں نے کہا کہ مسلمانوں کی سب سے زیادہ پسندیدہ شخصیت اقبال نے گرونانک کے بارے

میں اتنے اونچے خیالات کا اظہار کیا تھا پھر کیوں مسلمانوں اور سکھوں میں اچھے تعلقات قائم نہ ہو سکے۔اس کے جواب میں سردار منجیت سنگھ نے کہا کہ اصل یہ ہے کہ سیاسی جھگڑے اچھے تعلقات میں رکاوٹ بن گئے۔اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوئی کہ مغل حکمراں جہانگیر اور اورنگ زیب کے زمانے میں سکھ لیڈروں پر تشدد کیا گیا۔اس بنا پر دونوں فرقوں کے درمیان اچھے تعلقات نہ بن سکے۔

سردار منجیت سنگھ کے اس جواب کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ سیاسی تشدد سکھوں کے لیے زحمت میں رحمت (blessing in disguiese) ثابت ہوا۔اس کی وجہ سے سکھوں میں باہمی اتحاد کا جذبہ پیدا ہوا۔ان کے لیڈروں نے سکھوں کو منظم کیا۔اس کے بعد ہی ایسا ہوا کہ سکھ لوگ ایک طاقتور کمیونٹی کی حیثیت سے ابھر آئے۔اس سے انگریزوں نے فائدہ اٹھایا اور پھر بعد کو سکھوں کو خصوصی رعایتیں دیں۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پنجاب کا علاقہ ہندوستان کا سب سے زیادہ خوش حال علاقہ بن گیا۔حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر منفی پہلو کے ساتھ ہمیشہ مثبت پہلو موجود رہتا ہے۔

بینکاک سے ساڑھے تین گھنٹے کی پرواز کے بعد جہاز تائی پے (Taipei) میں اترا۔تائی پے کا ہوائی اڈہ اگرچہ دلی کے ہوائی اڈہ سے کافی بہتر تھا، مگر وہ بینکاک کے ہوائی اڈہ سے کم نظر آیا۔

تائی پے (Taipei) تائیوان کی راجدھانی ہے۔وہ کافی سرسبز ہے۔وہ پیسیفک سمندر کے کنارے واقع ہے۔وہ چین کے جنوبی ساحل سے 121 میل دور ہے۔1949 میں چین میں کمیونسٹ پارٹی غالب آ گئی۔اس وقت وہاں کی نیشنلسٹ گورنمنٹ کے افراد چین سے بھاگ کر تائیوان آ گئے۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ ہم چین کے حقیقی حکمراں ہیں، انہوں نے اپنی پروونزل گورنمنٹ بنائی جس کا صدر مقام تائی پے تھا۔تائی پے ہر طرف پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔یہاں کی آبادی زیادہ تر ان لوگوں پر مشتمل ہے، جو کمیونسٹ انقلاب کے بعد چین سے بھاگ کر یہاں آئے تھے۔

تائی پے اب ایک تجارتی مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔تائیوان میں مغربی ملکوں کی مدد سے کافی صنعتی ترقی ہوئی ہے۔1895 میں چین اور جاپان میں لڑائی ہوئی۔اس کے بعد تائیوان جاپان کے قبضے میں آ گیا۔دوسری عالمی جنگ میں جاپان کی شکست کے بعد تائیوان دوبارہ چین کو مل گیا۔

1949 سے وہ آزاد مملکت کی حیثیت سے قائم ہے۔ تائی پے کا رقبہ 272 مربع کلومیٹر ہے۔ نئی شہری پلاننگ میں یہاں زیادہ تر ملٹی اسٹوری بلڈنگیں بنائی گئی ہیں۔

تائی پے میں ہم لوگ جہاز سے نکل کر ائر پورٹ کی عمارت میں آگئے۔ یہاں سے شہر کے کچھ مناظر دکھائی دے رہے تھے۔ یہاں کے باتھ روم میں پانی کے جوٹیپ لگے ہوئے تھے، ان کو گھمانے یا دبانے کی ضرورت نہ تھی۔ ان کے نیچے ہاتھ لے جانے سے پانی اپنے آپ نکلنے لگتا تھا۔ چنانچہ اس کے اوپر آٹو (auto) لکھا ہوا تھا، یعنی خودکار۔

تائی پے سے آگے کے لیے روانگی ہوئی۔ دوران پرواز تائیوان کا انگریزی اخبار دی چائنا پوسٹ (The China Post) کا شمارہ 10 اگست 2003 دیکھا۔ اس کے صفحہ 2 پر ایک خبر تھی۔ اس کا عنوان یہ تھا:

Afghan Royalists move to restore the monarchy.

اس خبر کے تحت بتایا گیا تھا کہ افغانستان کے قدیم شاہی خاندان کے ایک فرد حکیم نورزئی نے ایک تحریک شروع کی ہے جس کا مقصد افغانستان میں دوبارہ بادشاہ کی دستوری حکومت کی واپسی (return of the constitutional monrachy) ہے۔ حکیم نورزئی اب تک حامد کرزئی کی حکومت میں محکمہ انٹلی جینس کے ڈپٹی ہیڈ تھے۔ اس عہدہ سے استعفا دے کر انہوں نے یہ تحریک شروع کی ہے۔ ان کی تحریک کے اکثر ممبران شاہی خاندان کے افراد ہیں۔ میں نے اس خبر کو پڑھا تو میرے دل نے کہا کہ اس تحریک کا نشانہ ماضی کی تاریخ کی واپسی ہے، اور ماضی کی گذری ہوئی تاریخ کبھی دوبارہ واپس نہیں آتی۔ اسماعیل میرٹھی نے بجا طور پر کہا ہے: گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

اس سفر میں نئی دہلی کے فادر آرنلڈ ڈیوڈ (Fr. Arnold David) سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران میں نے ان سے پوچھا کہ آپ یہ بتائیں کہ نوجوانوں کے لیے مسیحیت کی خاص ایڈوائس کیا ہے۔ انہوں نے اس سوال کے جواب میں کہا کہ تم زندگی اس طرح گزارو کہ تم خدا کو اور دوسروں کو اور اپنے آپ کو بھی خوش کر سکو:

Spend your life in a way that makes you, others and God happy.

ہماری آخری منزل سول (Seoul) تھی۔ جہاز سول کے ہوائی اڈہ پر اترا تو 10 اگست، شام 4 بجے کا وقت ہو چکا تھا۔ یہاں کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ اس واقعہ کا آغاز دہلی ائر پورٹ سے ہوتا ہے۔ دہلی ائر پورٹ پر ہمارا دستی بیگ جب مشین پر چیک کرنے کے لیے رکھا گیا تو اس کی اسکرین پر خطرے کی علامت ظاہر ہوگئی۔ اب عملہ کے کئی مرد اور عورت ہمارے بیگ کی تلاشی میں مصروف ہو گئے۔ میں حیران تھا کہ آخر اس بیگ میں کیا چیز ہے، جس کی اتنی زیادہ جانچ ہو رہی ہے۔ آخر تلاش بسیار کے بعد ایک بے ضرر آئٹم برآمد ہوا۔ یہ ایک چھوٹی سی قینچی تھی، جس میں ایک چھوٹا سا چاقو بھی لگا ہوا تھا۔ اس کو مجھے مانچسٹر میں ایک عرب تاجر نے دیا تھا، جس کو میں نے کبھی استعمال نہیں کیا۔ عملہ نے اس کو فوراً اپنے قبضہ میں لے لیا۔

تاہم یہ ناخوشگوار واقعہ میرے لیے ایک تجربہ بن گیا۔ یہاں ائر پورٹ پر تھائی ائرویز کے عملہ نے بتایا کہ آپ کا سامان آپ کو سول (Seoul) ائر پورٹ پر مل جائے گا۔ ہمیں اس یقین دہانی پر زیادہ بھروسہ نہ تھا۔ مگر جب ہم اپنا سفر طے کرنے کے بعد سول ائر پورٹ پر پہنچے تو میں نے دیکھا کہ یہاں تھائی ائرویز کے کاؤنٹر پر ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی ہماری قینچی پہنچ چکی تھی۔ یہ ایک مضبوط اور خوبصورت لفافہ میں بند تھی جس پر لکھا ہوا تھا:

Envelop for restricted item.

معلوم ہوا کہ عملہ کا ایک آدمی میز پر میرے انتظار میں کھڑا ہوا تھا۔ ترقی یافتہ ملکوں کے بارے میں میرا تجربہ ہے کہ یہ لوگ انسانی مشین (human machine) کی طرح کام کرتے ہیں، اور یہی ان کی ترقی کا اصل راز ہے۔

سول ائر پورٹ پر کانفرنس کی طرف سے کچھ افراد موجود تھے۔ ان کی رہنمائی میں ائر پورٹ سے شہر کے لیے روانگی ہوئی۔ کانفرنس کے کچھ اور شرکا اسی وقت سول ائر پورٹ پر پہنچے تھے۔ ان سب لوگوں کو جدید طرز کی ایک بس میں بٹھایا گیا۔ یہ ایک بہت بڑی بس تھی، جو گویا ہوائی جہاز کے فرسٹ کلاس کی ایک توسیع معلوم ہوتی تھی۔ اس ائرکنڈیشنڈ بس میں نہ صرف نہایت عمدہ نشستوں

کا انتظام تھا، بلکہ دوسری کئی چیزیں موجود تھیں۔ مثلاً اخبار، میگزین، لکھنے کا ڈیسک، گھڑی، وغیرہ۔ ان بسوں کو عام طور پر لیموزین (limousine) کہا جاتا ہے۔ وہ تیز رفتاری کے ساتھ چل رہی تھی، مگر سارے راستہ میں کہیں ایک بار بھی کوئی جھٹکا محسوس نہیں ہوا۔ یہ عمدہ سڑک کا کرشمہ تھا۔ سڑک پر کاریں دوڑ رہی تھیں، مگر یہ سب بڑی کاریں تھیں۔ یہاں کوئی چھوٹی کار دکھائی نہیں دی۔ سڑک کے دونوں طرف ترقی یافتہ شہر کے مناظر دکھائی دے رہے تھے۔ صفائی اور ہریالی یورپ کے ترقی یافتہ شہروں کی مانند تھی۔

کوریا ایک چھوٹا ملک ہے۔ اس کے دو حصے ہیں، نارتھ کوریا اور ساؤتھ کوریا۔ نارتھ کوریا میں جائیے تو وہاں ہر طرف غربت اور پس ماندگی کے مناظر دکھائی دیں گے۔ اس کے برعکس ساؤتھ کوریا میں ترقی اور خوش حالی کے مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ میں نے ایک صاحب سے اس فرق کا سبب پوچھا تو انھوں نے کہا کہ اس فرق کا سبب یہ ہے کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد جب جغرافیہ کا نقشہ بدلا تو نارتھ کوریا روس کے زیرِ اثر چلا گیا، اور ساؤتھ کوریا امریکا کے زیر اثر رہا۔ اس فرق کا تعلق صرف کوریا سے نہیں ہے بلکہ بہت سے دوسرے ملکوں میں یہی فرق دکھائی دیتا ہے۔ روس یا کمیونسٹ لیڈرشپ کے زیرِ کنٹرول ملکوں میں کوئی ترقی نہ ہوسکی۔ اگر کچھ ترقی ہوئی تو ہتھیار سازی میں۔ کیوں کہ کمیونزم کا فلسفہ یہ تھا کہ ہتھیار کی طاقت سے دنیا کے نظام کو بدلنا۔ اس کے برعکس جو ملک امریکا کے زیر اثر آئے، وہاں مادی ترقیوں کو فروغ حاصل ہوا۔ کیوں کہ امریکی نظریہ مادی ترقی میں یقین رکھتا تھا۔

سول (Seoul) ساؤتھ کوریا کی راجدھانی ہے۔ سول کا مطلب کوریائی زبان میں اسپیشل شہر ہے۔ یہ شہر 1394 سے غیر منقسم کوریا کی راجدھانی رہا ہے۔ سول ایک قدیم شہر ہے جس کا تذکرہ پہلی صدی عیسوی کی تاریخوں میں ملتا ہے۔ سول غیر منقسم کوریا کے تقریباً وسط میں واقع ہے۔ اس لیے وہ ملک کی راجدھانی کے لیے قدیم زمانے سے موزوں مقام سمجھا جاتا رہا ہے۔

یہاں کے ہر گھر میں ایک منزل گرم منزل ہوتی ہے۔ اس کا ڈیزائن سردی کے موسم کے لحاظ

سے بنایا جاتا ہے۔ اس منزل کو گرم کرنے کے لیے کوئلہ کو بطور ایندھن استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن کوئلہ سے نکالی ہوئی گیس لوگوں میں زیادہ مقبول ہو رہی ہے:

All houses have ondol ("heated") floors designed for the cold winter, coal is used as fuel to warm the ondol. but gases extracted from coal are increasingly in demand. 16/557

سول میں میرا قیام بلٹن ہوٹل کے کمرہ نمبر 526 میں تھا۔ اس کانفرنس میں 150 ملکوں کے تقریباً 350 آدمی آئے تھے۔ وہ سب اسی ہوٹل میں ٹھہرائے گئے تھے۔ ان شرکا میں مختلف ملکوں کے کئی مسلمان بھی شامل تھے۔

ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان نے گفتگو کے دوران کہا کہ میں ایک پریکٹسنگ مسلم ہوں۔ اسلام کو پرفکٹ ریلیجن مانتا ہوں، مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ قرآن میں ہے: لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ (2:256)۔ یعنی دین کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں۔ اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ بعد کی صدیوں میں مسلمان مسلح فوج کے ساتھ مختلف ملکوں میں داخل ہو گئے، اور ایشیا اور افریقہ اور یورپ کے بہت سے ملکوں میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ آخر اس کا کیا جواز تھا۔

میں نے کہا کہ قرآن میں قتال کا حکم صرف ایک مقصد کے لیے دیا گیا تھا، اور وہ تھا، فتنہ (religious persecution) کو ختم کرنا۔ یہ مشن خلافت راشدہ کے زمانے میں مکمل ہو گیا۔ اس کے بعد مسلمانوں کے لیے دنیا میں صرف ایک کام باقی رہا، اور وہ ہے پرامن دعوت۔

مزید وضاحت کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ظہورِ اسلام سے پہلے کی پوری تاریخ مذہبی تشدد (religious persecution) کی تاریخ ہے۔ خدا نے ہزاروں سال کے درمیان ایک لاکھ سے زیادہ پیغمبر بھیجے۔ ہر پیغمبر نے پرامن طور پر توحید کی دعوت دی۔ مگر مذہبی آزادی نہ ہونے کی وجہ سے ان کا کام آگے نہ بڑھ سکا۔ یہ سلسلہ حضرت مسیح تک جاری رہا۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا کہ وہ قتال کے ذریعے اس مذہبی جبر کا خاتمہ کر کے مذہبی آزادی کا دور دنیا میں لائیں۔

یہ کام ظہورِ اسلام کے ابتدائی چالیس سالوں میں بنیادی طور پر انجام پا گیا۔ تاہم دنیا میں

توہمات (superstitions) کا عمومی غلبہ تھا۔ اس لیے اس کام کی تکمیل کے لیے مزید کئی صدیاں درکار تھیں۔ مسلم لیڈروں کی بعد کے زمانے کی سیاسی کارروائیاں ایک اعتبار سے اس پراسس کی تکمیل کا ذریعہ بنیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہزار سالہ مسلم اقتدار ہی واحد سبب ہے، جس نے قدیم توہمات کا خاتمہ کیا۔ اس کے بعد ہی دنیا میں سائنسی دور کا آغاز ہوسکا۔ اس طرح اگرچہ ساتویں صدی عیسوی ہی میں فتنے کی جڑیں کمزور ہوچکی تھیں۔ مگر اس عمل کی تکمیل اور علمی طرز فکر(scientific attitiude) کا کامل ظہور اٹھارویں صدی کے بعد ممکن ہوسکا۔ اب انسان ایک ایسی دنیا میں ہے جہاں مکمل طور پر مذہبی آزادی کو تسلیم کرلیا گیا ہے۔ سائنسی طرزِفکر ساری دنیا میں آچکا ہے۔ فطرت میں چھپی ہوئی خدائی نشانیاں پوری طرح ظاہر ہوچکی ہیں۔ اب قتال کی کوئی ضرورت نہیں، اب عام حالات میں پرامن اسلوب ہی دعوت الی اللہ کے عمل کو انجام دینے کے لیے بالکل کافی ہے۔

میں نے کہا کہ دعوت کا اسٹینڈرڈ پیٹرن صرف ایک ہے اور وہ پرامن دعوت ہے اور تمام پیغمبروں نے اسی طریقے پر دعوتی کام کیا۔ پیغمبر آخر الزماں کے ظہور کے بعد وقتی ضرورت کے تحت قتال کی تدبیر جزئی طور پر اختیار کی گئی تھی۔ مگر اب حالات کی تبدیلی کے نتیجے میں دعوت کا اسٹینڈرڈ پیٹرن دوبارہ تاریخ میں واپس آگیا ہے۔ اب اہل حق کو پرامن دعوت کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔

11 اگست کو دوپہر کے کھانے کی میز پر کئی لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ ڈاکٹر اوصاف علی صاحب لِونگ انسائیکلو پیڈیا (living Encyclopaedia) ہیں۔ ان سے جو بات بھی پوچھیے، اس کے بارے میں ان کے پاس مکمل معلومات رہتی ہیں۔ ایک موقع پر میں نے پوچھا کہ دنیا میں ملکوں کی تعداد کیا ہے۔ انہوں نے فوراً بتایا کہ اقوام متحدہ میں جو ملک رجسٹرڈ ہیں ان کی تعداد 180 ہے۔ ان کے علاوہ کئی چھوٹے چھوٹے ملک ہیں جن کی حیثیت رجواڑہ جیسی ہے۔ مثلاً لکسم برگ وغیرہ۔ ایسے چھوٹے ملکوں کو لے کر موجودہ تعداد 220 بنتی ہے۔

ایک گفتگو کے ذیل میں انہوں نے بتایا کہ بُہرا فرقہ کے پیشوا کی ایک تقریب میں بہت

سے لوگ اکٹھا تھے۔ ہوٹل میں کھانے کی میز پر حلب کے مفتی محمد الحکیم کھانا کھا رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ایک مسلم جماعت کے ایک لیڈر بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے مفتی صاحب کی پلیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ کیا آپ نے تحقیق کرلی ہے کہ یہ کھانا حرام ہے یا حلال۔ مفتی حلب اس سوال پر غصہ ہو گئے۔ انہوں نے کہا کہ کیا آپ نے قرآن میں یہ آیت نہیں پڑھی: يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ (5:101)۔ یعنی اے ایمان والو، ایسی باتوں کے متعلق سوال نہ کرو کہ اگر وہ تم پر ظاہر کر دی جائیں، تو وہ تم کو ناپسندیدہ لگے۔

حافظہ کا ذکر ہوا تو انہوں نے بتایا کہ آلڈوس ہکسلے (Aldous Huxley) کا حافظہ (memory) بہت زبردست تھا۔ اس نے ایک بار کہا کہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا لے آؤ، میں اس کو اے سے زیڈ (A to Z) تک پڑھ کر اپنے حافظے میں رکھ لوں گا۔ چنانچہ اس نے انسائیکلو پیڈیا کو اے سے لے کر زیڈ (A to Z) تک پڑھ ڈالا۔ اس کے بعد انسائیکلو پیڈیا کے مضامین اس کے ذہن میں اس طرح محفوظ ہو گئے کہ دیکھے بغیر وہ بتا سکتا تھا کہ کس مسئلہ پر انسائیکلو پیڈیا میں کیا لکھا ہے۔ وہ بہت زیادہ پڑھتا تھا یہاں تک کہ آخر عمر میں وہ نابینا ہو گیا۔

ایک دلچسپ قصہ انہوں نے مولانا عبد العزیز میمن (1888-1978) کے بارے میں بتایا۔ وہ علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبہ عربی میں استاد تھے۔ ان کا حافظہ بہت قوی تھا۔ ان کے دماغ میں ہر قسم کی معلومات بھری ہوئی تھیں۔ چنانچہ لوگ ان سے اپنے سوالات پوچھا کرتے تھے۔ مگر ان کا ایک عجیب دستور تھا۔ وہ ہر سوال کے جواب میں پیشگی طور پر ایک روپیہ وصول کرتے تھے۔ علی گڑھ کے شعبۂ اسلامیات کے ایک صاحب نے بتایا کہ وہ ایک مقالہ لکھ رہے تھے، جس میں انہیں ایک مسئلہ کا ذکر کرنا تھا۔ اس کے بارے میں ان کو ضروری معلومات کہیں نہیں مل رہی تھیں۔ کسی نے بتایا کہ تم مولانا عبد العزیز میمن کے پاس جاؤ وہ تم کو بتا دیں گے۔ مولانا نے کہا: کل صبح آنا اور ایک روپیہ اپنے ساتھ لے آنا۔ چنانچہ وہ صبح کو ایک روپیہ کے ساتھ ان سے ملے، اور انہوں نے فوراً ان کے سوال کا مطلوب جواب دے دیا۔

لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ پیسہ کا کیا کرتے ہیں۔ یہ بات 1947 سے پہلے کے زمانے کی ہے جب کہ ایک روپیہ کی کافی قیمت تھی۔لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مولانا عبدالعزیز میمن ایسا کیوں کرتے ہیں۔مگر بعد کو معلوم ہوا کہ لوگوں سے پیسہ وہ اپنی ذات کے لیے نہیں لیتے تھے، بلکہ کتابوں کی خریداری کے لیے لیتے تھے۔ وہ نہایت سادہ زندگی گزارتے تھے۔ عام رواج کے خلاف وہ ملاقات کے وقت کسی کی تواضع نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنا سارا پیسہ کتابوں کی خریداری میں خرچ کرتے تھے۔

چنانچہ ان کے ذاتی کتب خانہ میں بہت زیادہ کتابیں اکٹھا ہوگئیں۔ 1947 کے بعد وہ اپنی کتابوں کے ساتھ پاکستان منتقل ہوگئے۔ صدر محمد ایوب خاں نے اپنی صدارت کے زمانہ میں ایک بڑا اسلامی ادارہ کھولنا چاہا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے عبدالعزیز میمن سے مدد چاہی۔عبدالعزیز میمن نے کہا کہ ایک معیاری تحقیقی ادارے کے لیے اچھا کتب خانہ بے حد ضروری ہے۔ جہاں تک میرے کتب خانہ کا تعلق ہے، وہ تو میں اس ادارے کے حوالہ کردوں گا۔لیکن اس میں بہت سی ضروری کتابیں نہیں ہیں۔ان کتابوں کو حاصل کرنے کے لیے کم سے کم 20 لاکھ روپئے کی ضرورت ہوگی۔اس کے علاوہ جب میں مختلف مما لک میں کتابیں حاصل کرنے کے لیے جاؤں گا، تو اس میں کم سے کم 20 لاکھ مزید خرچ ہوں گے۔صدر ایوب نے 40 لاکھ رقم ان کے حوالہ کردی۔ وہ قاہرہ، لندن، پیرس، تہران، وغیرہ جا کر تمام ضروری کتابیں لے کر آئے۔ یہ ادارہ انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک ریسرچ کے نام سے پہلے کراچی میں قائم ہوا تھا۔ بعد میں یہ ادارہ اسلامک انٹرنیشنل یونیورسٹی (اسلام آباد) کا ایک حصہ بن گیا۔

11 اگست کی شام کو کانفرنس کا افتتاح بلٹن ہوٹل کے بڑے ہال میں ہوا۔ یہ افتتاح ڈنر کے ساتھ ساتھ کیا گیا تھا۔یعنی لوگ میزوں پر بیٹھ کر شام کا کھانا کھا رہے تھے، اور ساتھ ساتھ پروگرام بھی سن رہے تھے۔افتتاحی تقریر (invocation) شیوامورتی شیوااچاریہ نے کی ۔ اس تقریر میں انہوں نے امن کی عالمی اہمیت کو بیان کیا، اور قیام امن کی اہمیت پر زور دیا۔ اس کے بعد آرک بشپ اور ڈاکٹر ڈائنا پریز (Diana Perez) کی تقریر ہوئی۔افتتاحی اجلاس کا ایک اہم جزء امن

کے موضوع پر بنا ہوا ایک ویڈیو ٹیپ تھا جس کو بڑی اسکرین پر دکھایا گیا۔ یہ دلچسپ اور معلوماتی تھا۔ اس میں اقوام متحدہ سے لے کر غیر سرکاری تنظیموں (NGOs) تک کی امن کی بارے میں سرگرمیاں باتصویر انداز میں بتائی گئی تھیں۔ اس پروگرام کو لوگوں نے بہت شوق سے دیکھا۔

افتتاحی اجلاس میں سوامی شیوا مورتی شیواچاریہ کی بھی تقریر تھی ۔ انہوں نے پہلے سنسکرت اشلوک سنائے، اوراس کے بعد انگریزی میں تقریر کی۔ ان کی تقریر کا ایک خاص جملہ یہ تھا۔ ہم یہاں سول میں اس لیے جمع ہوئے ہیں تا کہ روحانیت کی تلاش کرسکیں:

we have all assembled here in seoul to do some soul-searching

ایک اور مقرر نے اپنی مختصر تقریر میں کہا:

O God. lead me from Unreality to Reality. from darkness to light. from death to eternity.

سوڈان کے الصادق المہدی نے اپنی دو کتاب دی۔ ان کے نام یہ ہیں:

1۔ قضایا الوطن الراھنة فی خطاب السید الامام وخطبة الامین العام

Second Birth in Sudan_2

انگریزی کتاب میں برصغیر ہند کے جائزہ کے تحت یہ درج تھا کہ ابوالاعلیٰ مودودی خاص طور پر انڈیا کے مسلمانوں کے بارہ میں متفکر تھے کہ وہ ہندوازم سے مغلوبیت کے شکار ہوجائیں گے:

Abd al-Ala al_Mawdudi of India was particularly anxious about Moslems being overwhelmed by Hinduism in India (p. 46)

الصادق المہدی کو یہاں یہ بتانا چاہیے تھا کہ سید ابوالاعلی مودودی کی تشویش غلط ثابت ہوئی۔ ہندوازم خود مغربی تہذیب سے مغلوب ہوگیا، وہ نہ مسلمانوں کے اوپر غالب آسکا، اور نہ خود ہندوؤں کے اوپر۔

سول کی انٹرنیشنل کانفرنس میں تقریباً ہر مسلم ملک کے مسلمان آئے تھے۔ میں نے ان میں سے اکثر کی یا تو تقریر سنی یا ان سے انفرادی گفتگو ہوئی۔ ہر ایک بلا استثناء ایک ہی زبان بولتا تھا — مسلمانوں پر ظلم۔ یہ سارے لوگ اپنے مقدمہ کو ثابت کرنے کے لیے ہیومن رائٹس اور اقوام متحدہ

کے حوالے دیتے تھے۔ کسی کو بھی میں نے قرآن کے حوالہ سے سوچنے والا نہیں پایا۔ یہی قرآن کو کتاب مہجور بنانا ہے۔ اس غلط فکری کی وجہ سے ہر ایک نے اس کو حقوق انسانی کا مسئلہ بنا رکھا ہے۔ جب کہ قرآن کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ خدا کی سنت کا مسئلہ نظر آئے گا۔

حقوق انسانی کی تحریک بنیادی طور پر ردعمل کی تحریک ہے، ٹھیک اسی طرح جیسے اشترا کی تحریک ردعمل کی تحریک تھی۔ اس بنا پر حقوق انسانی کے علم بردار اکثر اس غلطی میں مبتلا رہتے ہیں کہ وہ اپنے مزاج کے مطابق، مفروضہ مظلوم کی حمایت اور مفروضہ ظالم کی مخالفت کرتے ہیں۔ میرے نزدیک مسلمانوں کو حقوق انسانی کے علم برداروں کی تقریروں میں اپنے مسئلہ کا حل نہیں ڈھونڈنا چاہیے۔ مسلمانوں کے مسئلے کا حل قرآن میں بتایا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ مسلمان اگر اپنے داخلی معاملے کو درست رکھیں، تو دوسروں کی طرف سے انہیں کبھی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ ایسی حالت میں مسلمانوں کا طریقہ احتساب خویش ہونا چاہیے، نہ کہ احتجاج غیر، جیسا کہ ہیومن رائٹس کے علم برداروں کا ہوتا ہے۔

ساؤتھ کوریا کی اس کانفرنس میں دنیا کے ہر حصے کے دانشور شریک ہوئے۔ یہ کانفرنس انسانی مسائل پر غور کرنے کے لیے بلائی گئی تھی۔ مگر میں نے دیکھا کہ تقریباً ہر مرد اور عورت بار بار ہنستے تھے، اور تالیاں بجاتے تھے۔ میں نے اپنے تجربہ میں لوگوں کے اندر انسانیت کا درد نہیں پایا۔

میں اس قسم کی بہت سی کانفرنسوں میں شریک ہوا ہوں۔ لوگوں کے رویہ کو دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دانشور حضرات کے لیے یہ ایک قسم کی آؤٹنگ یا ذہنی تفریح (Intellectual entertainment) ہے۔ لوگ رونے والے موضوعات کے نام پر فائیو اسٹار ہوٹلوں میں اکھٹا ہوتے ہیں، اور ہنسی اور قہقہہ کے ماحول میں کچھ وقت گذار کر واپس چلے جاتے ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں ان کانفرنسوں میں صرف اس لیے جاتا ہوں کہ وہاں کچھ نئے تجربات حاصل کروں، اور دعوتی مواقع کو بقدر امکان استعمال کروں۔

ساؤتھ کوریا کی اس کانفرنس میں دنیا کے مختلف حصوں کے لوگ بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ ان لوگوں سے ملاقاتوں کے دوران ایک نئی بات کا احساس ہوا۔ 1947 سے لے کر اب

تک تقریباً تمام لکھنے اور بولنے والے مسلمان ساری دنیا میں ایک ہی بات بتا رہے ہیں۔ وہ یہ کہ ہندوستان کے مسلمان مظلوم ہیں۔ ملک میں وہ پیسیو وائس (Passive voice) بنے ہوئے ہیں۔ پاکستان کا میڈیا مسلسل طور پر اسی نظریہ کے تحت چلایا جا رہا ہے۔

ہندوستان میں اس وقت مسلمان کسی بھی دوسرے مسلم ملک سے زیادہ ہیں۔ یعنی 22 کروڑ سے زیادہ۔ مگر باہر کی دنیا میں ہندوستانی مسلمانوں کا کوئی وزن نہیں۔ اس کا سبب خود مسلمانوں کی مذکورہ سیاست ہے۔ اس قسم کی مظلومانہ تصویر کے نتیجہ میں کچھ مسلم افراد کو یہ موقع تو ضرور ملا ہے کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کی مظلومیت کے نام پر باہر سے بڑے بڑے چندے لائیں۔ مگر دوسرا نقصان یہ ہے کہ انٹرنیشنل اسٹیج پر ہندوستانی مسلمان بالکل بے وزن ہو گئے ہیں۔ میں جب لوگوں کو بتاتا ہوں کہ ہندوستان میں مسلمان اچھی پوزیشن میں ہیں۔ وہ تقریباً ایک سو پارلیمنٹ کی سیٹ پر فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں۔ پوری مسلم دنیا کا سب سے زیادہ دولت مند آدمی ہندوستان میں ہے۔ پوری مسلم دنیا میں سب سے بڑا سائنس داں ہندوستان میں ہے، پوری مسلم دنیا کا سب سے بڑا انڈسٹریل ہاؤس انڈیا میں ہے۔ پوری مسلم دنیا میں سب سے زیادہ دینی سرگرمیاں ہندوستان میں ہیں تو انہیں یقین نہیں آتا۔

ایک صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ آج کل کی دنیا میں سب سے بڑا فتنہ وہ لوگ ہیں، جن کو انٹلکچول (intellectuals) کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ خوبصورت الفاظ بول کر لوگوں کو مغالطہ میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ مثال دیتے ہوئے میں نے کہا کہ سوویت یونین میں جب کمیونزم کا عملی تجربہ بری طرح ناکام ہو گیا، تو کمیونسٹ نظریہ کو بچانے کے لیے یہ کہا جانے لگا کہ اسٹالن جیسے کچھ لوگوں کی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔ اسی زمانہ میں ایک کمیونسٹ لیڈر نے اس موضوع پر ایک کتاب شائع کی جس کا نام تھا — انقلاب کے ساتھ غداری (Revolution Betrayed)۔ حالانکہ کتاب کا صحیح ٹائٹل یہ ہونا چاہیے تھا — انقلاب ناکام (Revolution Failed)۔ یہی کام موجودہ زمانے میں مسلم انٹلکچول بھی بڑے پیمانہ پر کر رہے ہیں۔

یہاں ایک عرب عالم نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ جہاد (بمعنی قتال) کو ایک موقت

فریضہ مانتے ہیں۔ یعنی ایک وقت خاص میں وہ فرض کیا گیا تھا، اور اب اس کی فرضیت ساقط ہوگئی ہے۔ میں نے کہا کہ استغفر اللہ، ایسا میں نے نہ کبھی لکھا اور نہ کہا۔ میں نے کہا کہ میرا کہنا صرف یہ ہے کہ جہاد (بمعنی قتال) ذریعہ ہے، نہ کہ مقصد۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ حسن لذاتہ نہیں ہے، بلکہ وہ حسن لغیرہ ہے۔ یہ تو وہی بات ہے کہ جس کو تمام علما اور فقہا مانتے ہیں۔ پھر اس میں اعتراض کا کیا پہلو ہے۔

ایک پروفیسر صاحب سے نظریہ ارتقا پر گفتگو ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ ارتقا (evolution) کا نظریہ تو ایک حقیقت ہے۔ آپ دیکھیے، انسان اور حیوان میں ایک چھوٹا بچہ پیدا ہوتا ہے۔ پھر وہ بڑھتے بڑھتے انسان یا حیوان بن جاتا ہے۔ کیا یہ ارتقا نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ یہ تدریجی نشونما ہے۔ ڈاردینی ارتقا کا نظریہ اس سے مختلف ہے۔ ڈاروینی ارتقا یہ ہے کہ ایک نوع کے اندر سے دوسری نوع نکلی۔ یعنی مختلف انواع حیات الگ الگ پیدا نہیں ہوئیں۔ بلکہ ایک ابتدائی نوع سے دوسری تمام انواع نکلتی رہیں۔ یہ دوسرا نظریہ ابھی تک صرف قیاس ہے۔ وہ کوئی ثابت شدہ چیز نہیں۔

دمشق کے جناب ڈاکٹر محمد الحبش سے ملاقات ہوئی۔ وہ وہاں کی پارلیمنٹ کے ممبر ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ شام کے تعلیم یافتہ لوگ عام طور پر آپ کی کتابیں پڑھ چکے ہیں اور آپ کے خیالات سے پورا اتفاق کرتے ہیں۔ اس سے پہلے لاس اینجلیز میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس لیے انہوں نے دیکھتے ہی مجھے پہچان لیا۔ یہاں آنے والے مسلمان شرکا اکثر میری کتابوں کے ذریعے مجھ سے واقف تھے۔ اکثر سے مختصر گفتگو ہوئی۔ یہ عرب لوگ ''الاسلام یتحدی'' کو بہت پسند کرتے تھے۔ مگر جہاد اور دعوت کے بارے میں میرے خیالات سے کچھ لوگوں کو پورا اتفاق نہ تھا۔

کچھ مسلمانوں نے رائٹ اور جسٹس کی بات کہی۔ انہوں نے کہا کہ آج کی دنیا میں مسلمانوں کے ساتھ جسٹس نہیں ہو رہا ہے۔ انہیں ان کے رائٹ سے محروم کیا جا رہا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ آئڈیلزم ہے، اور اس دنیا میں آئڈیلزم کبھی چلنے والا نہیں۔ آپ کے لیے صحیح یہ ہے کہ آپ عملی طریقہ اختیار کریں۔ ہم کو یہ نہیں دیکھنا ہے کہ نظری اعتبار سے کیا چیز ٹھیک ہے، بلکہ یہ دیکھنا ہے کہ عملی اعتبار

سے کیا چیز ممکن ہے:

We should not see what is ideally right, but we have to see what is parctically possible.

یہی اس دنیا میں حقیقت پسندی کا طریقہ ہے۔ حقیقت پسندی کا یہ فائدہ ہے کہ آدمی کوفوراًاپنے عمل کے لیے مثبت نقطۂ آغاز مل جاتا ہے، جب کہ دوسرے طریقے میں صرف لڑائی جھگڑا جاری رہتا ہے، اور مثبت معنوں میں نقطۂ آغاز کبھی نہیں ملتا۔

ایک تعلیم یافتہ کشمیری سے بات ہوئی۔ وہ اب کشمیر کو چھوڑ کر برطانیہ میں رہتے ہیں۔ انہوں نے کشمیر کے بارے میں اقوام متحدہ کے رزولیوشن اور سیلف ڈٹرمنزم، وغیرہ کی باتیں کیں۔ میں نے کہا کہ زندگی میں کبھی لاجک نہیں چلتی۔ 1947 سے پہلے مسلم لیڈر یہ کہا کرتے تھے کہ مسلمانوں کو اپنے مذہب کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے ایک علیحدہ ملک چاہیے، ایک ایسا ملک جہاں وہ نہ انگریزوں کے زیر اثر ہوں، اور نہ ہندوؤں کے زیر اثر۔

مگر تقسیم کے بعد پاکستانی مسلمان بڑی تعداد میں پاکستان سے نکل کر برطانیہ اور امریکا جیسے ملکوں میں چلے گئے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، پانچ لاکھ کشمیری مسلمان صرف برطانیہ میں رہتے ہیں۔ یہ تقسیم کی لاجک کے بالکل خلاف ہے۔ جب پاکستان بن گیا اور مسلمانوں کا علیحدہ مطلوب مسلم خطہ قائم ہو گیا، تو آپ لوگوں نے کیوں ایسا کیا کہ آپ دوبارہ انہیں انگریزوں کے زیر اقتدار آ کر برطانیہ میں رہنے لگے، جن کو پہلے آپ سامراجی اور غیر اسلامی بتاتے تھے۔ آخر اس غیر منطقی روش کے لیے آپ کے پاس کیا دلیل ہے۔ میری اس بات کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

ایک مسلمان پروفیسر نے یہ شکایت کی کہ اس وقت ساری دنیا میں مسلمانوں کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ افریقہ کے جنگل میں ایک درخت گرے تو کوئی اس کو دیکھنے والا نہ ہوگا۔ یہی حال آج کی دنیا میں مسلمانوں کا ہو رہا ہے۔ اگر مسلم دنیا میں کوئی آدمی ظلم کا شکار بنایا جائے تو اس پر میڈیا میں کوئی رپورٹ نہیں آتی۔ میں نے کہا کہ آپ کی یہ شکایت بالکل بے جا ہے۔ آپ میڈیا سے وہ امید رکھتے ہیں جو کبھی پوری ہونے والی نہیں۔ میڈیا کسی معاملے کو مسلم اور غیر مسلم کی نظر سے

نہیں دیکھتا، وہ اس کو اپنے انٹرسٹ کے لحاظ سے دیکھتا ہے، میڈیا دوسری تجارتوں کی طرح ایک تجارت ہے، میڈیا کوئی فلاحی ٹرسٹ نہیں :

Media is a business like other business. Media is not a public trust.

میں نے کہا کہ آپ کو چاہیے کہ میڈیا کو ایک تجارتی ادارے کی حیثیت سے دیکھیں، نہ کہ ہیومن رائٹس کے آرگن کی حیثیت سے۔

ایک صاحب اقوام متحدہ میں سروس کرتے تھے۔ وہ ایک اچھے عہدہ پر تھے۔ اب وہ ریٹائر ہوگئے ہیں۔ انہوں نے پسماندہ رقم سے اپنا الگ ادارہ بنایا ہے۔ انہوں نے سول میں اپنی تقریر کے دوران اقوام متحدہ پر کھل کر تنقید کی۔ اس پر لوگوں نے خوب تالیا بجائیں اور قہقہے لگائے۔

دوسری طرف میں اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا رو رہا تھا۔ میرے ذہن میں بار بار یہ خیال آتا تھا کہ وہ لوگ کتنے غیر سنجیدہ ہیں، جو ایک ادارہ میں وفادارانہ طور پر سروس کریں، اور جب اس سے رٹائر ہوں، تو اس پر تنقید شروع کردیں۔ اس سے بھی زیادہ عجیب وہ لوگ ہیں جو اس قسم کی دوعملی پر تالیاں بجائیں۔

زمبابوے سے آئے ہوئے ایک صاحب نے بتایا کہ مجلس العلماء زمبابوے کی طرف سے پانچ سال سے زمبابوے کے یومیہ انگریزی اخباری ہیرالڈ (The Herald) میں ایک آرٹیکل ہفتہ میں ایک مرتبہ شائع ہوتا ہے۔ اس کالم کا نام دی ہولی قرآن اسپیکس (The Holy Qur'an Speaks) ہوتا ہے۔ اس میں قرآن مجید کی وہ آیتیں مع تفسیر و ترجمہ شائع ہوتی ہیں، جو عمومی انسانیت کے لیے مفید ہوں۔ مثال کے طور پر — لَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ (2:237)، لَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا (17:37)، وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا (2:83)، وغیرہ۔ یہ آرٹیکل مسلم اور غیر مسلم دونوں میں مقبول ہے۔ مزید پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ اس کالم کی اشاعت کے لیے وہ ایک ماہانہ رقم مذکورہ اخبار کو ادا کرتے ہیں۔ گویا مذکورہ اخبار کے لیے وہ ایک ایڈورٹائزمنٹ ہے، اور شائع کرانے والوں کے لیے وہ ایک دعوتی صفحہ۔

ایک تعلیم یافتہ مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک مشرقی ملک میں پیدا ہوئے، اور اب وہ

ایک مغربی ملک میں رہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ فلسطین اور کشمیر اور پاکستان جیسے ملکوں سے بہت سے مسلمان بھاگ کر امریکا اور برطانیہ پہنچے۔ اب وہ وہاں کے نظام سے پوری طرح ایڈجسٹ کر کے رہتے ہیں۔ وہ ان مغربی ملکوں میں آرام کی زندگی گزار رہے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ وہ ایک مجرمانہ روش میں مبتلا ہیں۔ وہ مشرقی ملکوں میں بسنے والے مسلمانوں کے اندر مسلسل طور پر منفی ذہن پیدا کر رہے ہیں۔ میں نے پایا ہے کہ مغربی ملکوں میں بسنے والے یہ مسلمان ہمیشہ مشرقی ملکوں کی حکومتوں کے خلاف منفی تقریریں کرتے ہیں۔ حالاں کہ انہیں یہ کرنا چاہیے کہ وہ اپنے تجربے کی روشنی میں مشرقی ملکوں کے مسلمانوں سے کہیں کہ ہم مغربی ملکوں میں ایڈجسٹ کر کے رہتے ہیں اس لیے ہم کو یہاں امن اور خوشحالی ملی ہوئی ہے۔ تم بھی اپنے ملکوں میں وہاں کی حکومت اور وہاں کے نظام سے ایڈجسٹ کر کے رہو۔ اس کے بعد تم کو بھی ہماری طرح امن اور خوشحالی حاصل ہو جائے گی۔

آج اگست 2003 کی 12 تاریخ ہے۔ صبح کو اٹھا تو دیر ہو چکی تھی۔ رات دیر تک مصروفیت رہی اس لیے صبح کو کسی قدر تاخیر سے نیند کھلی۔ فجر کی نماز میں کم وقت کی وجہ سے میں نے چھوٹی سورتیں پڑھی — أَلَمْ تَرَ كَيْفَ اور لِإِيلَافِ قُرَيْشٍ۔ أَلَمْ تَرَ كَيْفَ اور لِإِيلَافِ قُرَيْش کی تلاوت کرتے ہوئے یہ بات ذہن میں آئی کہ قرآن ایک ابدی ہدایت ہے۔ اس لیے یہ دونوں سورتیں قرآن میں صرف ایک گذرے ہوئے واقعہ کے حوالہ کے طور پر نہیں ہوسکتیں۔ یقیناً اس میں آج کے لیے بھی سبق ہے، اور وہ سبق یہ ہے — تم عبادتِ رب پر قائم ہو جاؤ، اور پھر تمہارے معاصر اصحابِ فیل کے مقابلہ میں خدا تمہارے لیے کافی ہو جائے گا۔ اس اعتبار سے آج مسلمانوں کا جو حال ہے اس کی تصویر فارسی کے ایک شعر میں اس طرح ملتی ہے :

خانۂ شرع خراب است کہ اربابِ صلاح   درعمارت گریٔ گنبدِ اسلافِ خود اند

12 اگست کی شام کو تین بجے سے چوتھا اجلاس شروع ہوا۔ اس کا موضوع مڈل ایسٹ میں قیام امن کا مسئلہ تھا۔ بولنے والوں میں سے ایک برطانیہ کے لارڈ نذیر احمد تھے۔ انداز بیان اور انگریزی زبان کے لحاظ سے ان کی تقریر کافی اچھی تھی۔ مگر جو بات انہوں نے کہی اس سے مجھے اتفاق نہ

تھا۔ اپنی عام عادت کے خلاف میں نے چاہا کہ جلسے کے بعد ان سے اس موضوع پر بات کروں۔ اپنے وزٹنگ کارڈ کی پشت پر یہ مضمون لکھ کر انہیں بھیجا:

Dear Loard Nazir Ahmad.
I wish to meet you after this session. Can you please spare some time? (Room No. 526)

بعد کو لارڈ نذیر احمد سے تفصیلی ملاقات ہوئی۔ وہ اصل کشمیری ہیں مگر اب وہ برطانیہ کے باشندہ بن چکے ہیں۔ وہ ٹونی بلیر کی پارٹی میں شریک ہو کر وہاں کی سیاست میں سرگرم حصہ لے رہے ہیں۔ چنانچہ انہیں برطانیہ کے ہاؤس آف لارڈز کا ممبر بنا دیا گیا ہے (برطانیہ کا ہاؤس آف لارڈز انڈیا کے راجیہ سبھا کی مانند ہے)، اسی بنا پر وہ لارڈ نذیر احمد کہے جاتے ہیں۔

لارڈ نذیر احمد (پیدائش 1957) سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک گفتگو کے دوران انہوں نے کہا کہ ٹررزم کی بات سب کرتے ہیں، مگر اسٹیٹ ٹررزم کی بات کوئی نہیں کرتا۔ میں نے کہا کہ ٹررزم کا لفظ غیر حکومتی لوگوں کی طرف سے مسلح کارروائی کے لیے بولا جاتا ہے۔ اسلام اور جدید بین اقوامی قانون کے مطابق، غیر حکومتی تنظیموں کو ہتھیار اٹھانے کا حق نہیں۔ اس معاملے میں اسلام کا مسلک یہ ہے کہ آپ کو اگر کسی سے شکایت ہے، تو آپ یا تو صبر کریں یا پر امن دائرے میں اپنی جدو جہد چلائیں۔ انفرادی ٹرزم اور ریاستی ٹررزم میں یہ فرق ہے کہ انفرادی ٹررزم اصولاً ہی غلط ہے، جب کہ ریاستی ٹررزم عملی طور پر غلط۔

انہوں نے مزید کہا کہ کوئی مذہب خود کش بمباری کو حق بجانب نہیں سمجھتا، مگر مظلوم فلسطینی کیا کریں۔ ظلم ہے تو وہ ہتھیار اٹھائیں گے۔ میں نے کہا کہ کوئی بھی عذر خود کش بمباری کے لیے وجہ جواز نہیں۔ فلسطینیوں کے لیے پر امن جدو جہد کا راستہ اسی طرح کھلا ہوا تھا، جس طرح گاندھی اور نیلسن منڈیلا نے انڈیا اور ساؤتھ افریقہ میں پر امن جدو جہد کا طریقہ اختیار کیا۔ مگر فلسطینیوں نے اپنی تحریک کے آغاز ہی میں غلط رخ اختیار کر لیا۔ ان کی اس غلط روی کے ذمہ دار خود عرب رہنما ہیں، نہ کہ کوئی دوسرا فریق۔

لارڈ نذیر احمد نے برطانیہ میں اپنی سرگرمیوں کی تفصیل بتائی۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ اس وقت جو کام کر رہے ہیں، وہ صرف کمیونٹی ورک ہے۔ مگر آپ کی صلاحیتوں کے اعتبار سے یہ آپ کے لیے ایک کمتر درجہ کا کام ہے۔ آپ اس سے زیادہ بڑا کام کرسکتے ہیں، اور وہ دعوہ ورک ہے۔ یورپ اور امریکا میں اس وقت سخت ضرورت ہے کہ مثبت انداز میں اسلام کی دعوت لوگوں تک پہنچائی جائے اور اسلام کا صحیح تعارف پیش کیا جائے۔ آپ یہ کام بہت اچھا کرسکتے ہیں۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ میری اس تجویز پر سنجیدگی کے ساتھ غور کریں گے۔

سول کے بک اسٹال پر راقم الحروف کی انگریزی کتابیں موجود تھیں۔ وہ میری ترغیب کے بغیر خود سے بک اسٹال پر گئے، اور میری کتابوں کا ایک سٹ حاصل کیا۔

میرا تجربہ ہے کہ کانفرنسوں میں زیادہ تر ان لوگوں کو تالیاں ملتی ہیں، جو اچھا حافظہ رکھتے ہوں، اور طرح طرح کی معلومات دیتے ہوں۔ مگر اسی کے ساتھ میرا دوسرا تجربہ یہ ہے کہ جن لوگوں کے اندر حافظ کی صلاحیت زیادہ ہو، ان میں تجزیہ کی صلاحیت اتنی ہی کم ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زیادہ معلومات دینے والے کوئی مفکرانہ بات نہیں کہہ پاتے۔ تفکیر کے لیے تجزیہ (analysis) کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن میرا تجربہ ہے کہ زیادہ حافظہ والے لوگ عام طور پر تجزیہ کی صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں۔ حافظہ کی کمی ریفرینس کی کتابوں کے ذریعے پوری ہوسکتی ہے۔ لیکن تجزیاتی صلاحیت کی کمی کو کسی دوسرے ذریعے سے پورا نہیں کیا جاسکتا۔

تاریخ کے کئی مشہور لوگ اس معاملے میں عبرتناک مثال پیش کرتے ہیں۔ مثلاً کارل مارکس کے اندر حافظہ کی غیر معمولی صلاحیت موجود تھی۔ معلومات کے انبار سے اس کا دماغ گویا ایک انسائیکلو پیڈیا تھا۔ مگر میرے اندازہ کے مطابق، اس کے اندر تجزیاتی صلاحیت تقریباً مفقود تھی۔ چنانچہ اس نے تجزیہ کے معاملے میں احمقانہ غلطیاں کیں۔ میں نے اپنی کتاب میں اس اعتبار سے کئی مثالیں دی ہیں۔ ملاحظہ ہو: مارکسزم، تاریخ جس کو رد کرچکی ہے۔

کانفرنس کی طرف سے یہاں ایک بڑا بک اسٹال لگایا گھا تھا۔ اس بک اسٹال پر راقم

الحروف کی انگریزی کتابیں موجود تھیں۔ گاڈ ارائزز (God Arises) نامی کتاب کے تمام نسخے پہلے ہی دن لوگوں نے خرید لیے۔ چھوٹے چھوٹے پمفلٹ بھی اسی طرح بہت جلد ختم ہو گئے۔ کئی لوگوں نے کتابوں کا پورا سٹ لیا۔ ان میں سے ایک صاحب وہ تھے جو ڈنمارک سے آئے تھے۔ بک اسٹال کے ناظم ڈاکٹر ابراھام نے بتایا کہ میں نے آپ کی کتاب آئیڈیولوجی آف پیس (The Ideology of Peace) خریدی ہے، اور اس کو پڑھ رہا ہوں۔ آپ کی یہ کتابیں اگر مجھ کو پہلے مل گئی ہوتیں، تو شاید میری زندگی کا نقشہ دوسرا ہوتا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد وہ تلاش کے دور سے گزرے تھے۔ اس کے بعد وہ اس انٹرنیشنل تنظیم سے جڑ گئے جس نے موجودہ کانفرنس کا اہتمام کیا ہے۔

یہاں میں ایک بک اسٹال کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے مالک نے میری دلچسپی کو دیکھ کر مجھے ایک کتاب گفٹ کے طور پر دی۔ کتاب کا نام یہ تھا:

Winning the human race
Zed Books Ltd. London and New Jersey, 1988

کتاب کے ایک باب کے تحت سابق امریکی صدر فرنکلن روزولٹ (1882-1945) کا ایک قول نقل کیا گیا تھا۔ وہ قول یہ تھا:

The motto of war is: Let the strong survive, let the week die. The motto of peace is : Let the Strong help the week to survive.

میرے نزدیک یہ جملہ جنگ اور امن کا قدیم بیان ہے۔ نئی تعریف یہ ہونی چاہیے — جنگ کا مقصد دوطرفہ تباہی ہے، اور امن کا مقصد دوطرفہ نجات ہے۔

12 اگست کی شام کو ماس میڈیا کے پینل ڈسکشن میں شرکت کی۔ ہر مقرر نے بتایا کہ میڈیا اوپینین فارمیشن (opinion formation) کا ایک طاقتور ذریعہ ہے۔ اس سے پبلک کی رائے کو گہرے طور پر متاثر کیا جا سکتا ہے۔ مگر کسی نے اس سلسلے میں میڈیا کے تعمیری رول کی کوئی مثال پیش نہیں کی۔ میں نے کہا کہ میرے لیے آپ لوگوں کی رائے سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ میرے نزدیک میڈیا کوئی اصلاحی مشن نہیں، میڈیا ایک تجارتی ادارہ ہے۔ میڈیا کا کام نیوز کو سل (sell)

کرنا ہے۔میڈیا کا کام تعمیری ذہن سازی نہیں۔

ایک مغربی پروفیسر نے زور دے کر کہا کہ امن کے لیے گڈ گورنینس(good governance) کی سخت ضرورت ہے۔اس موضوع پر بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ پیس کا تعلق گڈ گورنینس سے نہیں ہے، بلکہ یہ کرائسس مینجمنٹ(crisismanagement) کا ایک اشو ہے۔امریکا میں اچھی حکومت موجود ہے،مگر امریکا ویت نام، افغانستان،عراق میں بے فائدہ جنگ کا مرتکب ہوا، ایسی جنگ جس کے لیے امریکا کے پاس کوئی حقیقی مبرر(justification) موجود نہ تھا۔

اصل یہ ہے کہ ہر قوم میں کرائسس کا لمحہ آتا ہے۔ یہ فکری قیادت کا امتحان ہوتا ہے۔اگر قیادت آرٹ آف کرائسس مینجمنٹ کی اہل ہو تو وہ امن قائم کرنے میں کامیاب ہوگی، اور اگر اس اعتبار سے وہ نااہل ہو، تو گڈ گورنینس کے باوجود وہ اپنی قوم کو جنگ کی طرف لے جائے گی۔

13 اگست کی صبح کو امریکا سے آئے ہوئے ایک صاحب تقریر کررہے تھے۔یہاں تک کہ صدر نے گھنٹی بجادی۔اس کا مطلب یہ تھا کہ آپ کا وقت ختم ہو گیا۔اس پر مقرر اور سامعین دونوں ہنس پڑے۔اس قسم کے غیر سنجیدہ لوگ نہ درست طور پر سوچ سکتے ہیں، اور نہ کسی درست فیصلہ پر پہنچ سکتے ہیں۔13 اگست کی صبح کو ہمارے ناشتے کی میز کے پاس دوسری میز پر چھ جاپانی بیٹھے ہوئے تھے۔ہر ایک سنجیدگی کا نمونہ بنا ہوا تھا۔ایک بولتا تو سارے نہایت خاموشی کے ساتھ اس کی بات کو سنتے تھے۔کوئی شخص درمیان میں کبھی نہیں بولتا تھا، نہ زور سے بولنا، نہ ہنسنا، نہ جوک چھوڑنا۔

جاپانیوں میں یہ استثنائی صفت کیوں ہے، اس کا جواب مشکل ہے۔مگر میں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ خواہ دینی معاملہ ہو یا سیکولر معاملہ، دونوں میں کامیابی کے لیے اسی قسم کی سنجیدگی ضروری ہے۔ سنجیدگی کے بغیر اس دنیا میں کوئی بڑی کامیابی ممکن نہیں۔

ایک مقرر اسٹیج پر آئے، تو انہوں نے کہا کہ یہاں مجھے انگریزی زبان میں بولنا ہے، حالانکہ میری مادری زبان انگریزی نہیں۔ یہ ایک مشکل کام ہے کہ آدمی جاپانی زبان میں سوچے، اور انگریزی میں بولے، یا وہ عربی زبان میں سوچے اور انگریزی زبان میں بولے:

It is difficult to think in japanese and speak in English or to think in Arbic and speak in English.

میرے ساتھ بھی یہی معاملہ اکثر پیش آتا ہے۔ میں اردو زبان میں سوچتا ہوں، مگر کانفرنسوں میں مجھے انگریزی زبان میں بولنا پڑتا ہے۔ ایسے مواقع پر میں یہ سوچ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ خدا نے انسان کو کیسی عجیب قدرت دی ہے کہ وہ ایک زبان میں سوچے، اور عین اسی وقت وہ دوسری زبان میں کلام کرے۔

13 اگست کی صبح کو مجھے تقریر کرنی تھی۔ صبح کو میں نے دو رکعت صلاۃ الحاجۃ ادا کرکے قرآن میں مذکور حضرت موسی والی دعا پڑھی: وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِنْ لِسَانِي، يَفْقَهُوا قَوْلِي (20:27-28)۔ یعنی اور میری زبان کی گرہ کھول دے، تاکہ لوگ میری بات سمجھیں۔ حضرت موسیٰ کے زمانے میں یہ حال تھا کہ داعی اور مدعو کی زبان ایک تھی۔ میرا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ یہاں داعی کی زبان اور ہے، اور مدعو کی زبان اور۔ دل میں خیال آیا کہ خدایا، تو اس دعا کو میرے لیے ایک اضافے کے ساتھ قبول فرما — اِفقه قَولَهُم ويَفقَهُوا قَولِي (میں ان کی بات کو سمجھوں، اور وہ لوگ میری بات کو سمجھیں)۔

13 اگست 2003 کو دوپہر بعد کے پروگرام میں میری تقریر تھی۔ میری تقریر کا موضوع تھا: امن کا قابلِ عمل فارمولا کیا ہے۔ میں نے اپنی تقریر میں قرآن وحدیث کے کچھ حوالے دیتے ہوئے بتایا کہ امن اس طرح قائم نہیں ہوسکتا کہ ہم بے امنی کا خاتمہ کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ بے امنی کو برداشت کرنے سے امن قائم ہوتا ہے، نہ کہ بے امنی کو ختم کرنے سے۔ اس دنیا میں منفی تجربات ضرور پیش آئیں گے مگر ہم کو ان کا جواب مثبت انداز میں دینا ہے۔ ہمیں ڈیفرینس کو برداشت کرنا ہے۔ ہم کو اپنے دشمن کا بھی احترام کرنا ہے۔ خدا کے تخلیقی نقشے کے مطابق کوئی اور چیز ممکن نہیں۔

صحافیوں کی ایک مجلس میں ایک مغربی صحافی نے کہا کہ صحافی کا کام سچائی کو بتانا ہے، صحافی کا کام یہ نہیں کہ وہ بتائے کہ سچائی کو کیا ہونا چاہیے:

Job of journalist is to tell the truth, job of jurnalist is not what the truth ought to be.

میں نے کہا کہ یہ آدھی بات ہے۔ آج کا صحافی صرف یہ نہیں کرتا کہ وہ سچائی کو بتائے، بلکہ وہ آدھی سچائی کو بتاتا ہے۔ جدید صحافت کی اصل کمزوری یہ ہے کہ وہ انتخابی رپورٹنگ (selective reporting) کی انڈسٹری بن گئی ہے۔ صحافت اگر واقعہ کی مکمل رپورٹنگ کرے، تو ایسی حالت میں کوئی مسئلہ پیدا ہونے والا نہیں۔

ایک مجلس میں کچھ ماہر ماحولیات (enviormentalist) اکٹھا تھے۔ ایک صاحب نے کہا کہ اس زمانے کا سب سے بڑا مسئلہ صنعتی کثافت (industrial pollution) ہے۔ میں نے کہا کہ صنعتی کثافت بلا شبہ ایک مسئلہ ہے۔ مگر میرے نزدیک اس سے بھی زیادہ بڑا مسئلہ وہ ہے، جس کو فکری کثافت (intellectual pollution) کہا جا سکتا ہے۔ پریس اور میڈیا کے رواج کے بعد یہ ہوا ہے کہ ہر عورت اور ہر مرد اپنے افکار فضا میں بکھیر رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ساری دنیا مختلف افکار کا جنگل بن کر رہ گئی ہے۔ فطری طرز فکر تقریباً ختم ہو گیا۔ اسی مصنوعی صورتِ حال کا یہ نتیجہ ہے کہ آج کی دنیا میں طرح طرح کی تحریکیں ابھر رہی ہیں، ایسی تحریکیں جو صرف مسائل میں اضافہ کرنے والی ہیں، وہ مسائل کو ختم کرنے والی نہیں۔

ایک مقرر نے اپنی تقریر کے خاتمہ پر یہ تجویز پیش کی کہ یہاں جو مذہبی لیڈر جمع ہیں، وہ یہاں سے واپس جا کر اپنی اپنی کمیونٹی میں امن کے لیے کام کریں۔ جلسہ کے بعد ایک صاحب نے اس تجویز پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ میں نے کہا کہ یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ آج کل ہر کمیونٹی کا یہ حال ہے کہ اس میں اپنے حقوق کو لے کر پر جوش تحریکیں چل رہی ہیں۔ ہر کمیونٹی جذباتی حد تک رائٹ کانشش (right conscious) ہو گئی ہے۔ جب کہ امن کے قیام کے لیے ایک ایسا سماج درکار ہے، جو ڈیوٹی کانشش (duty conscious) ہو۔ ایسی حالت میں صبر آزما قسم کے ایک مسلسل عمل کی ضرورت ہے۔ صرف کچھ تقریریں کر دینے سے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔

ایک مقرر نے امن پر تقریر کرتے ہوئے پر جوش طور پر کہا کہ امن میرا پیدائشی حق ہے:

peace is my birth right.

مقرر کے یہ الفاظ لوگوں کو اتنے اچھے لگے کہ پورا ہال تالیوں گونج اٹھا۔ پورے ہال میں غالباً میں اکیلا تھا جس نے تالی نہیں بجائی۔ میرے نزدیک یہ ایک سطحی بات ہے۔ امن اگر انسان کا پیدائشی حق ہے، تو اسی کے ساتھ امن کے حالات کا قیام انسان کا پیدائشی فرض ہے۔ فرض کی ادائیگی کے بغیر کسی کو اس کا حق نہیں مل سکتا، نہ امن اور نہ کوئی دوسری چیز۔

آج اگست 2003 کی 14 تاریخ ہے۔ صبح کے وقت ہوٹل کے کمرہ میں دیوار سے لگے ہوئے بڑے شیشے کے پاس بٹھا ہوا ہوں۔ سامنے سڑک کے دوسری طرف ایک پہاڑ نظر آرہا ہے۔ اس کے اوپر ایک سفید بلڈنگ صبح کی روشنی میں چمک رہی ہے۔ پہاڑ کے اوپر گھر بنانے کا رواج قدیم زمانہ سے ہے۔ قدیم زمانے میں پہاڑ پر چڑھنا بہت مشکل تھا، تب بھی انسان پہاڑ کے اوپر گھر بناتا تھا۔ اب پہاڑ کے اوپر چڑھنا آسان ہے، تب بھی انسان پہاڑ کے اوپر گھر بنا رہا ہے۔ ''اونچی رہائش'' ہر انسان کی تمنا ہے مگر ''اونچی سوچ'' کی تمنا کرنے والے بہت کم ملیں گے۔ سوچ کے اعتبار سے لوگ نچلی سطح پر جی رہے ہیں مگر رہائش کے اعتبار سے وہ اونچی سطح پر رہنا چاہتے ہیں۔ یہ ایک تضاد ہے۔ مگر اس تضاد میں آج کے 99 فیصد سے زیادہ انسان مبتلا ہیں۔ وہ فکری بلندی کو نہیں جانتے، وہ صرف رہائشی بلندی کو جانتے ہیں۔

ناروے (Norway) کے ایک مسلمان ملے۔ ان کا نام مسٹر اسلم احسن تھا۔ انہوں نے بتایا کہ میں پاکستان سے وہاں گیا۔ ناروے ایک ترقی یافتہ اور خوش حال ملک ہے۔ مگر وہاں بہت سردی رہتی ہے۔ ٹمپریچر آج 14 اگست کو بھی نقطہ انجماد سے نیچے ہے۔ ناروے میں عام طور پر، چھ ماہ رات، چھ ماہ دن رہتا ہے اور کبھی تو مسلسل سورج رہتا ہے اور رات نہیں آتی۔ انہوں نے بتایا کہ اس موسم کے باوجود وہاں سارے کام معمول کے مطابق ہوتے رہتے ہیں۔ وہ کتابوں کا کاروبار کرتے ہیں۔ وہ بک اسٹال سے ہماری کتابیں خرید کر لے گئے۔

انہوں نے کہا کہ ناروے میں (اور اسی طرح دوسرے مغربی ملکوں میں) ہمارے جیسے لوگوں کے لیے سب سے بڑا پرابلم صرف ایک ہے، اور وہ یہ ہے کہ بچوں کو یہاں کی مادی تہذیب کے

اثرات سے کس طرح بچایا جائے۔ میں نے کہا کہ اس معاملے میں دفاعی تدبیر کبھی مؤثر نہیں ہوسکتی۔ صرف اقدامی تدبیر ہی مؤثر ہوسکتی ہے اور وہ دعوت ہے۔ لیکن دعوت کو اگر صرف ایک تدبیر کے طور پر اختیار کیا گیا تو وہ مفید نہ ہوگا۔ دعوت کا کام طلب آخرت اور انسانوں کی خیر خواہی کے جذبے کے تحت ہونا چاہیے۔

14 اگست کو دوپہر کا سیشن خاص طور پر ساؤتھ کوریا اور نارتھ کوریا کے مسئلہ پر بحث کے لیے تھا۔ کئی ماہرین کی تقریریں ہوئیں۔ مگر مسئلہ کا کوئی حل سامنے نہ آسکا۔ ایک مقرر نے اپنی تقریر کا خاتمہ اس طرح کیا کہ ضرورت ہے کہ نیو آرڈر آف کوآپریشن (new order of co-operation) دنیا میں لایا جائے۔ مگر وہ نہ بتا سکے کہ یہ نیو آرڈر آف کوآپریشن کیا ہے۔

ایک موقع پر یہ ذکر آیا کہ نارتھ کوریا سخت قسم کے مسائل ومصائب میں مبتلا ہے۔ ایک مغربی اسکالر نے کہا کہ نارتھ کوریا کے مسائل کا ذمہ دار امریکا ہے۔ اس نے معاشی پابندیاں لگا کر یہ صورت حال پیدا کی ہے:

> All the misery, North Korea is facing , is due to the American's economic warfare.

میں نے کہا کہ یہ نظریہ درست نہیں، امریکا جو کچھ کر رہا ہے وہ جوابی کارروائی ہے۔ اور جب بھی آپ کسی کے لیے مسئلہ بنیں گے تو وہ آپ کے خلاف جوابی کارروائی کرے گا۔ اس قسم کی جوابی کارروائی کبھی برابری کے اصول پر نہیں ہوتی۔ یعنی ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ جتنا کریں، ٹھیک اتنا ہی دوسرا بھی کرے۔ اس قسم کی برابری موجودہ دنیا میں کبھی ممکن نہیں ہوتی۔ اس لیے جو کمزور ہو اس کو چاہیے کہ وہ طاقتور سے ٹکراؤ نہ کرے، اور اگر وہ ٹکراؤ کرتا ہے، تو پھر شکایت اور احتجاج نہ کرے۔ وہ اس کو یہ سمجھ کر قبول کرے کہ یہ خود میرے عمل کی قیمت ہے جو مجھ کو مل رہی ہے۔

آج 15 اگست کی صبح ہے۔ دہلی (انڈیا) کے لیے آج کا دن آزادی ملنے کا دن ہے۔ مگر سول (Seoul) میں زندگی اپنے معمول پر جاری ہے۔ یہاں 15 اگست کی تاریخ کسی قومی یادگار سے وابستہ نہیں۔ ہندوستان کی سیاسی تاریخ کی وجہ سے وہاں کے لوگوں کے جذبات 15 اگست کی

تاریخ سے وابستہ ہو گئے ہیں۔مگر کوریا کے لوگوں کے لیے 15 اگست کے لفظ میں اس قسم کی کوئی جذباتی وابستگی نہیں۔ اسی قسم کی اضافی چیزیں ہیں، جو ایک قوم کو دوسری قوم سے الگ کرتی ہیں۔ آدمی اپنے ملک کے اندران کو حقیقی سمجھنے لگتا ہے۔ حالانکہ وہ اپنے ملک کے باہر جائے تو محسوس کرے گا کہ ان کی کوئی اہمیت نہیں۔

کئی لوگ پر جوش طور پر یہ تجویز پیش کرر ہے تھے کہ اقوام متحدہ میں انٹر ریلیجس کونسل قائم کی جائے۔ یہ لوگ اس تجویز کا تذکرہ اس طرح کرتے تھے جیسے کہ وہ مسئلہ کے حل کی جانب کوئی بہت بڑا قدم ہے۔مگر یہ ایک خوبصورت تجویز کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس طرح کے ادارے پہلے ہی سے اقوام متحدہ کے اندر موجود ہیں۔ پھر نئے نام کے ساتھ ایک اور دارہ قائم کرنے سے کیا فائدہ۔

میری معلومات کے مطابق، اقوام متحدہ میں دو قسم کے شعبے قائم ہیں۔ایک، امدادی شعبہ، اور دوسرا، رہنما شعبہ۔ پہلی قسم کے شعبے وہ ہیں، جن کے تحت اقوام متحدہ مال یا سامان کے ذریعے لوگوں کی مدد کرتی ہے۔ یہ شعبے کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں۔ دینے والا جب دے رہا، ہو تو کوئی بھی لینے والا اس سے انکار نہیں کرتا۔ اس کے مقابلے میں دوسرے شعبے وہ ہیں، جو قوموں سے کچھ کرنے کے لیے کہتے ہیں۔ واقعات بتاتے ہیں کہ اس دوسرے شعبے کے تحت کوئی قوم اقوام متحدہ کی ہدایت کو قبول نہیں کرتی۔ جہاں تک انٹر ریلیجس کونسل کا معاملہ ہے، وہ اس دوسرے شعبہ سے متعلق ہے۔ پھر عملی طور پر وہ کس طرح مؤثر ثابت ہو سکے گا۔

اسرائیل کے اندر اب بھی عربوں کی ایک تعداد اسرائیلی شہری کی حیثیت سے رہتی ہے۔ ان میں سے ایک عرب ساؤتھ کوریا کی کانفرنس میں بھی آئے تھے۔ ان کا نام محمد خلیل کیوان (.Tel 049881238 058758234) ہے۔ ان سے میں نے پوچھا کہ اسرائیل کے اندر جو مسلمان رہتے ہیں، ان کا حال کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ خیر کی حالت میں ہیں۔ ان پر کوئی پابندی نہیں۔ اِلّا یہ کہ کوئی وہاں کے امن میں خلل ڈالے۔ پر امن عربوں کے لیے وہاں کوئی مسئلہ نہیں۔

اجتماع کے آخری دن الوداعی تقریب میں کانفرنس کے تمام شرکا ڈنر کی میز پر تھے۔ اس وقت

کانفرنس کے ایک ذمہ دار کی تقریر ہوئی، اور اس کے بعد کچھ ساز ونغمہ کا پروگرام ہوا۔ اس دوران مذکورہ اسرائیلی عرب مائک پر آگئے۔ پہلے وہ کچھ بولے، اور پھر انہوں نے گانے کے انداز میں لا الہ الا اللہ کہنا شروع کردیا۔ وہ بار بار مائک پر لا الہ الا اللہ کہتے تھے، اور تمام شرکا تالیاں بجا بجا کر لا الہ الا اللہ کو دہراتے تھے۔ تقریب کے خاتمے پر ایک شخص نے ان سے کہا کہ آپ نے پورا کلمہ نہیں پڑھوایا۔ انہوں نے ہنستے ہوئے جواب دیا کہ آج آدھا کلمہ پڑھوادیا ہے، اگلے موقع پر ان شاء اللہ ان کو پورا کلمہ پڑھواؤں گا۔

کانفرنس کے بعض مقررین کی کچھ باتیں یہاں نقل کی جاتی ہیں۔

امریکا کے پال ایف چیمبرلن (Paul F. Chamberlin) نے ایک سیشن میں اپنا تفصیلی پیپر پیش کیا۔ اس کا عنوان تھا— قوموں کے درمیان امن قائم کرنے کے لیے درگذر اور عالی ظرفی کی اہمیت:

Forgiveness and Magnanimity as instruments of peace between Nations.

اس پیپر میں نارتھ کوریا کے حوالے سے بتایا گیا تھا کہ امریکا کو یہ شکایت ہے کہ نارتھ کوریا بڑی مقدار میں خطرناک ہتھیار بنا رہا ہے، اور یہ کہ اس سلسلے میں اس کے ارادے جارحانہ ہیں۔ نارتھ کوریا کو اس سے روکنے کے لیے امریکا نے اس کے خلاف اقتصادی پابندیاں لگا رکھی ہیں۔ اس کا بھی اندیشہ ہے کہ امریکا اس کے اوپر باقاعدہ حملہ کردے۔ مگر یہ حملہ صرف نارتھ کوریا کو نقصان نہیں پہنچائے گا، بلکہ اسی کے ساتھ وہ ساؤتھ کوریا، جاپان اور خود امریکا کے لیے بھی سخت نقصان کا باعث ہوگا۔ ایسی حالت میں ضروری ہے کہ نارتھ کوریا سے مقابلے کے لیے طریق کار کو بدلا جائے۔ انہوں نے اپنا یہ پیپر ان الفاظ میں ختم کیا تھا— آئیے ہم موت کے مقابلہ میں زندگی کا انتخاب کریں:

Let's schoose life.

امریکی اسکالر پال ایف چمبرلن (Paul F. Chamberlin) خارجہ پالیسی کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ انہوں نے ایک تقریر کی، جس کا عنوان یہ تھا— بین اقوامی معاملات میں امریکا کا رول:

The Role and Responsibility of the United State in Internationa Affairs

انہوں نے بتایا کہ 1797 میں صدر جارج واشنگٹن نے اپنی الوداعی تقریر میں کہا تھا کہ امریکا کو اپنے مفاد کے لیے کام کرنا چاہیے، نہ کہ دوسروں کے مفاد کے لیے:

He counselled that the United States must act in its own intrests, not those of others.

مگر صدر ٹرومین نے دوسری عالمی جنگ کے بعد یہ پالیسی بدل دی۔ 1990 میں کولڈ وار کے خاتمہ کے بعد جارج بش سینیر کے زمانے میں نیو ورلڈ آرڈر کے نام سے اس میں مزید اضافہ ہوا۔ 11 ستمبر 2001 کے واقعے کے بعد جارج بش جونیر کے زمانہ میں امریکا کی خارجہ پالیسی میں یہ توسیع بہت زیادہ بڑھ گئی۔ اس قسم کی باتیں بتاتے ہوئے انہوں نے کہا کہ امریکا کی اقتصادیات اتنے زیادہ بوجھ کو کب تک برداشت کرتی رہیں گی۔

کناڈا میں مقیم ڈاکٹر قاری حسین (Auckbaraullee) نے اپنے پیپر میں اسلام کے بارے میں کچھ باتیں کہیں۔ انہوں نے کہا کہ تاریخی طور پر اسلام الہام کے لمبے ترقیاتی سفر کا آخری مرحلہ ہے:

Historically, Islam is the last phase of a long development of Revelation in history.

اسلام کی یہ تعبیر درست نہیں۔ اسلام کسی لمبے الہامی سفر کی ارتقائی صورت نہیں ہے۔ یہ ارتقائی اصول اس معاملے پر منطبق نہیں ہوتا۔ اصل یہ ہے کہ اسلام خدا کے دین کی محفوظ صورت، وہ اس کی ارتقائی صورت نہیں۔

سویڈن کے برٹل پرسن (Bertil Person) کا ایک پمفلٹ یہاں تقسیم کیا گیا۔ یہ دراصل ایک لکچر تھا، جو انہوں نے یونائیٹڈ کنگ ڈم (Saint Hill Manor, East Grinstead) میں 26-23 مئی 2002 کو دیا تھا۔ اس کا ٹائٹل یہ تھا:

Filling the moral vacuum

اس لکچر میں جو کچھ بتایا گیا تھا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ انسان کی زندگی میں اس وقت جو خلا پیدا

ہو گیا ہے، اس کو بامعنی طور پر صرف روحانیت پُر سکتی ہے:

The only thing that can fill the present moral vacuum with meaningful contents and quality of life is spirituality.

پمفلٹ میں بتایا گیا تھا کہ روحانیت کا خلاصہ وہ چیز ہے، جس کو گاڈ کہا جاتا ہے:

Spirituality is the essence for "That which we call God"

پھر اسی پمفلٹ میں یہ بھی درج تھا کہ خدا کا عقیدہ ابھی بھی فکری سوال کا درجہ حاصل نہیں کر سکا ہے:

"Belief in God" is still not an intellectual question.

اس پمفلٹ میں مجھے دو کمیاں نظر آئیں۔ ایک یہ کہ اس میں واضح طور پر یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ روحانیت کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس میں ایک طرف روحانیت کو عقیدۂ خدا پر مبنی قرار دیا گیا تھا، اور دوسری طرف اس میں یہ اعتراف بھی کیا گیا تھا کہ خدا کا عقیدہ ابھی تک علمی اعتبار سے کوئی ثابت شدہ عقیدہ نہیں۔ جن لوگوں کا یہ خیال ہو کہ خدا صرف ایک مفروضہ ہے، نہ کہ کوئی حقیقی واقعہ، ایسےلوگوں کے لیے خدا کا تصور کس طرح ایک حقیقی روحانیت کا ماخذ بن سکتا ہے۔

روس کے ویلیری ساکھرو (valerity Sakharov) نے 12 اگست 2003 کو اپنا لکچر دیا۔ وہ کئی انٹرنیشنل اداروں کے ذمہ دار رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی تقریر میں امن سے متعلق مسائل کا ذکر کرتے ہوئے اس پر زور دیا کہ مختلف پارٹیوں کے درمیان ڈائیلاگ ہونا چاہیے۔ مسائل پر ڈائیلاگ کی بات تقریباً تمام اہل علم کرتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہ ڈائیلاگ تو کئی نسلوں سے جاری ہے۔ ایسی حالت میں اصل سوال یہ ہے کہ ڈائیلاگ کے باوجود مسائل کے حل کا راستہ کیوں نہیں نکلا۔ گویا اصل سوال ڈائیلاگ کے فقدان کا نہیں ہے، بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ ڈائیلاگ کے باوجود مسائل کا حل کیوں ابھی تک دریافت نہ ہو سکا۔ میں نے بہت سے نیشنل اور انٹرنیشنل ڈائیلاگ میں حصہ لیا ہے۔ یہ ڈائیلاگ ہمیشہ انٹلیکچول لوگوں کے درمیان ہوتا ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ ہر انٹلیکچول ایگوئسٹ ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ تمام ڈائیلاگ عملاً دو فریقوں کے درمیان ایگو

کلیش (ego clash) بن کر رہ جاتے ہیں۔ وہ کسی مفاہمت تک نہیں پہنچتے۔

کوریا کے چی ہولیو (Chi Holew) نے ساؤتھ کوریا اور نارتھ کوریا کے تعلقات پر لکچر دیا۔ انہوں نے کہا کہ ایک عجیب صورتِ حال ہے کہ ایک ہی ملک کے دو حصے ہیں، اور دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ مثلاً نارتھ کوریا میں غربت ہے، اور ساؤتھ کوریا میں خوش حالی۔ نارتھ کوریا میں آمریت ہے، اور ساؤتھ کوریا میں آزادی۔ ایک طرف بند سماج ہے اور دوسری طرف کھلا سماج:

One side is a closed society, the other side is an open one.

تاہم اس مسئلہ کا وہ کوئی حل نہ بتا سکے۔ میرے نزدیک اس معاملے میں زیادہ ذمہ داری نارتھ کوریا کی کمیونسٹ حکومت کی ہے۔ عجیب بات ہے کہ روس اور چین کی کمیونسٹ حکومتوں نے زمانے کے حالات کے اعتبار سے حقیقت پسندی کا انداز اختیار کرلیا۔ مگر نارتھ کوریا اور برما جیسی بعض حکومتیں ابھی تک اس معاملے میں غیر حقیقت پسندانہ انداز ختیار کیے ہوئے ہیں، اور اس کی نہایت مہنگی قیمت ان ملکوں کے عوام ادا کر رہے ہیں۔

مالوڈوا (Molodova) کے نمائندہ ڈاکٹر وائرل پریس کاری (Viorel Prisacari) نے مذہبی ہم آہنگی پر تقریر کی۔ انہوں نے اس سلسلہ میں اقوام متحدہ کے رول پر خصوصی زور دیتے ہوئے کہا:

The United Nations has to become involved into establishing peace among religions. In order to work for this goal, the United Nations structure has to undergo serious changes.

یہ صرف ایک کہنے کی بات ہے۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد جمعیت اقوام (League of Nations) بنی تھی۔ اس کے بعد اسی تبدیلی کے نظریے کے تحت یہ ہوا کہ جمعیت اقوام کی جگہ اقوام متحدہ کا نیا ادارہ وجود میں آیا، مگر اصل مسئلہ بدستور اپنی جگہ پر قائم رہا۔

اصل یہ ہے کہ اقوام یا اقوام متحدہ یا کوئی تیسری بین اقوامی تنظیم، ہر ایک کی محدودیت ہے۔ اس قسم کی کوئی بھی تنظیم کبھی ورلڈ گورنمنٹ کی حیثیت اختیار نہیں کرسکتی۔ اس مسئلہ کا حل صرف

یہ ہے کہ اس حقیقت کو تسلیم کرلیا جائے۔

ہونولولو (Honolulu) کے ڈاکٹر الیگزینڈر دائی مان سور(Alexandre Y. Mansourov) نے ایک تفصیلی پیپر پیش کیا۔ اس کا عنوان یہ تھا۔ روس اور کوریا کے جزیرہ نما کا مستقبل:

Russia and the Future of the Korean Peninsula.

اس پیپر میں موضوع سے متعلق بہت سی باتیں تھیں۔ ایک قابلِ ذکر بات یہ تھی کہ انہوں نے بتایا کہ نارتھ کوریا اور ساؤتھ کوریا کا دوبارہ اتحاد دونوں ملکوں کی قیادت کی نئی نسل سامنے آنے کے بعد زیادہ آسان ہوسکتا ہے:

It may be easier to solve the problem of unification for a new generation of South and North Korean leaders.

یہ اصول انڈیا اور پاکستان جیسے ملکوں پر بھی منطبق ہوتا ہے۔ اگر دونوں ملکوں میں اتحاد کی تحریک اٹھے، تو سرحد کے دونوں طرف اس کو امید افزا جواب مل سکتا ہے، خاص طور پر نوجوان نسل میں۔

مصر کے سابق پرائم منسٹر عبدالعزیز حجازی (پیدائش 1923) نے ایک لمبا پیپر پڑھا۔ میرا احساس ہے کہ یہاں کی اکثر تقریریں ایسی تھیں، جو کانفرنس کے اصل موضوع سے کم ہی تعلق رکھتی تھیں۔ مصر کے سابق پرائم منسٹر کا پیپر اس معاملے میں مستثنیٰ نہ تھا۔ اس پیپر کا عنوان یہ تھا:

The World at a Turning Point
A Global Vision of Peace and Good Governance.

کمبوڈیا کے سڈک کروم خون نوروڈم (Sdeck Krom Khun Norodom) نے ایک تقریر کی۔ وہ کمبوڈیا کی کئی تنظیموں کے ذمہ دار ہیں۔ ان کی تقریر کا عنوان یہ تھا:

Peace in South-East Asia: The Way for world.

انہوں نے اپنی تقریر میں ساؤتھ ایسٹ ایشیا کے کئی مسائل بتائے، اور کہا کہ ہمیں ان مسائل کو حل کرنا ہے۔ مثلاً:

Human trafficking, drung smuggling, sea piracy, illegal trade for small arms, cyber crime and terrorism.

مقرر نے اس طرح کے مسائل بتا کر کہا کہ ہمیں ان مسائل سے لڑنا ہے اور ان سے فائٹ کرنا ہے۔ مگر انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ کس طرح لڑنا ہے، اور کس طرح ان مسائل کو حل کرنا ہے۔ یہ مسائل تو ہر ایک کو معلوم ہیں۔ اصل ضرورت یہ ہے کہ ان مسئلوں کا کوئی قابل عمل حل بتایا جائے۔

کروشیا (Croatia) کے ڈاکٹر مارکو ٹارل (Marko Tarle) کی تقریر کا عنوان تھا:

Cultural Heterogeneousness and Biotechnological Challenges.

انہوں نے پوسٹ ماڈرن ورلڈ (Post Modern World) کا ذکر کیا، اور اس سلسلے میں مختلف باتیں کہیں۔ انہوں نے کہا کہ تاریخ کا خاتمہ ابھی نزدیک نہیں ہے، کیوں کہ سائنس ابھی اپنے خاتمے تک نہیں پہنچی ہے:

The end of history is not near since the end of science is far from being reached.

یہ بات درست نہیں۔ کیوں کہ تاریخ کا خاتمہ خدا کے فیصلے کے طور پر ہوگا، نہ کہ سائنس کے کسی مرحلے کے طور پر۔ مقرر نے کہا کہ گلوبلائزیشن نے اس بات کو ممکن بنا دیا ہے کہ انسانی علم اور انسانی حقوق کو ساری دنیا میں پھیلایا جا سکے:

Globalisation makes possible the spread of human knowledge and human rights all over the world.

یہی معاملہ سچائی کو پھیلانے کا بھی ہے۔ قدیم زمانے میں حق کی دعوت صرف محدود دائرے کے اندر کی جا سکتی تھی۔ اب حق کی دعوت عالمی سطح پر پھیلائی جا سکتی ہے۔ جدید نسل کے لیے یہ ایک ایسا موقع ہے، جو پچھلی کسی بھی نسل کو حاصل نہ تھا۔

کرغیزستان چنگیز ایٹ ماٹو (Chingis Aitmaotv) کی تقریر کا عنوان یہ تھا۔ دنیا انقلاب کے موڑ پر، امن اور بہتر حکومت کا عالمی نقشہ:

The World at a Turning Point
A Global Vision of Peace and Good Governance.

انہوں نے کہا کہ آج دنیا سمیٹ کر ایک ہوگئی ہے۔ کسی بھی جگہ سے دوسری جگہ کے لیے ڈائرکٹ فون کال ممکن ہوگئی ہے۔ چند گھنٹوں میں دنیا کے کسی بھی حصہ تک پرواز کر کے پہنچنا ممکن ہو

گیا ہے۔ مگر ابھی بھی ہم دوسروں کو دشمن کی نظر سے دیکھتے ہیں:

We still see an enemy in others.

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ انسانی دوری کو ختم کرنے کے لیے ایک عالمی آئیڈیالوجی کی ضرورت ہے، صرف عالمی ٹکنالوجی کے ذریعے ایسا ہونا ممکن نہیں۔

سوئزرلینڈ سے آئے ہوئے اقوام متحدہ کے سابق انڈر سکریٹری جنرل ڈاکٹر نہاد فہمی (Nihad Fahmy) نے ایک پیپر پیش کیا۔ اس پیپر کا عنوان یہ تھا — تہذیبوں کے درمیان ڈائیلاگ:

Dialogue Among Civilizations

مقرر نے اس سلسلے میں باہمی گفت وشنید کے لیے کچھ اصول بتائے تھے۔ ان میں سے ایک اصول، ان کے الفاظ میں مینجمنٹ آف کانفلکٹ (management of conflicts) تھا۔ یہ اصول بہت اچھا ہے۔ مگر اس کا کوئی واضح فارمولا مذکورہ تقریر میں موجود نہ تھا۔ میرے نزدیک اکثر حالات میں نزاع کو ختم کرنے کی سب سے زیادہ آسان صورت یہ ہوتی ہے کہ اسٹیٹس کو (status quo) کو مان لیا جائے، یعنی حالت موجودہ پر تصفیہ کرکے معاملہ کو ختم کر دیا جائے تا کہ تعمیر کا سفر رکے بغیر جاری رہے۔

فلپائن کے ڈاکٹر اسٹینس لوسش کیوک (Stanislav Shushkevich) نے اپنی تقریر میں بتایا کہ آئی آئی ایف ڈبلیو پی (IIFWP) کی یہ کوشش ہے کہ اقوام متحدہ کے اندر ایک سپریم ریلیجس کونسل (Supreme Religious Council) قائم کی جائے جو عالمی سطح پر مذہبی امور کی نگراں ہو۔ انھوں نے بتایا کہ فلپائن کی حکومت اس کے لیے راضی ہوگئی ہے کہ وہ اس تجویز کو اپنی طرف سے اقوام متحدہ میں باضابطہ طور پر پیش کرے۔

یہ تجویز بظاہر بہت اچھی ہے۔ مگر اس کی افادیت زیادہ یقینی نہیں۔ 1993 میں اقوام متحدہ کی طرف سے دنیا کے تمام مذاہب کی ایک عالمی کانفرنس نیویارک میں ہوئی تھی۔ اس کے لیے کافی اہتمام کیا گیا تھا۔ مگر عملاً وہ بے فائدہ رہی۔ اقوام متحدہ کی یہ کانفرنس مذاہب کے درمیان اتحاد قائم کرنے

میں کوئی مؤثر آغاز بھی نہ کرسکی۔ ایسی حالت میں اس قسم کی ایک نئی تجویز سے کیا فائدہ حاصل ہوگا۔

اسرائیل کی ایک نمائندہ مسز شیلا گھ شلیو (Shelagh shalev) نے اپنی تقریر میں کہا کہ میڈیا میں پیش کردہ تصویر کے برعکس، مجھے پورا یقین ہے کہ مڈل ایسٹ کے لوگ امن کے خواہش مند ہیں، اور امن قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ دنیا کے دوسرے لوگوں سے مختلف نہیں۔ دونوں جانب کی بالغ آبادی میں کی گئی رائے شماری اور سروے سے اندازہ ہوتا ہے کہ عرب اور اسرائیل دونوں کی بڑی اکثریت امن چاہتی ہے، اور اس مقصد کے لیے دونوں ہی سمجھوتہ کرنے پر تیار ہیں:

Unlike the picture painted in the media, I fimly believe that the peoples of Middle East yearn and seek for peace, not different that all peoples world-wide. Polls and serveys conducted in the adult population on each side indicate that the vast majority of Israelies and Palestinians want peace and are willing to make compromises towards that goal.

پناما سے آئی ہوئی ڈاکٹر انا مورا ڈی ویک لینڈ (Ana Mora de Wakeland) کی تقریر کا عنوان یہ تھا — لاطینی امریکا میں اکیسویں صدی میں خاندان کا رول:

The Role of the Family in the 21st century in Latin America.

انہوں نے اپنی تقریر میں جو باتیں کہیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ تعلیم کا آخری مقصد یہ ہے کہ طلبہ کی مدد کرکے انہیں اس قابل بنایا جائے کہ وہ اپنے پورے امکانات اور صلاحیتوں کے ساتھ انسانیت کی خدمت کرسکیں:

The final goal of education is to help the student place the fullness of his potentialites and talents to the service of fellow humans.

یہ مقصد بجائے خود درست ہے۔ مگر اصل مسئلہ یہ ہے کہ انسان کے اندر سیلف انٹرسٹ کا طاقتور جذبہ ہے۔ ایسی حالت میں دوسروں کی خدمت کو کس طرح انسان کا گول بنایا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک انسانی خدمت کے لیے زیادہ طاقتور محرک نہ ہو، کوئی شخص صحیح معنوں میں انسانی

خدمت نہیں کرسکتا۔

کریبین جزیرہ گراناڈا (Granada) کے گورنر جنرل دانیال ولیمس (Daniel Williams) کی تقریر کا عنوان یہ تھا:

The World at a Turning Point: Innovative Approaches to Peace through Responsible Leadership and Good Governance.

انہوں نے اپنی تقریر میں موجودہ زمانہ کی مادی ترقیوں کا ذکر کیا، اور کہا کہ ترقیوں کے ساتھ دنیا میں سنگین مسائل موجود ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر امن اور خوشی دونوں دولت کے اضافے کے باوجود ایک ساتھ نہیں چل رہے ہیں، تو یہ ایک اجتماعی مسئلہ ہے جس کو بہر حال حل کیا جانا چاہیے:

If Peace and happiness are not marching side by side with the incrasing wealth of the world, then the world has serious societal problems to be addressed.

اس معاملے میں اصل مسئلہ ضرورت کو بتانے کا نہیں ہے، بلکہ اس کا قابلِ عمل فارمولا بتانے کا ہے، اور یہ چیز مذکورہ تقریر میں مجھے نظر نہیں آئی۔

برطانیہ کے ڈاکٹر کلنٹن بینیٹ (Clinton Bennett) کی تقریر کا عنوان یہ تھا — عالمی حکومت اور امن، انٹرنیشنل نظام کے محاسبہ کی تجویز:

Global Governance and Peace
Proposal to Audit the International Order.

انہوں نے مختلف باتیں کہیں۔ مثلا انہوں نے کہا کہ عالمی مسائل کا حل یہ ہے کہ ایک واحد عالمی حکومت قائم کی جائے:

The answer to the world's problem lies in a single world Government.

میرے نزدیک یہ کوئی تجویز نہیں، یہ صرف ایک خیالی بات ہے۔ کیوں کہ ایسی عالمی حکومت قائم ہونا سرے سے ممکن ہی نہیں۔ اسی طرح انہوں نے کہا کہ لوگ ساری دنیا میں سیاست پر شک وشبہ میں مبتلا ہیں، اور حکومت کے بارے میں مایوس ہیں۔ ایسی حالت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے

کہ یہ حکومتیں اپنے عوام کی کتنی نمائندہ ہیں:

Peoples throughout the world are suspicious of polities and disillusioned with Government, so that the degree that Governments really represent their citizens is questionable.

عوام کا اپنی حکومتوں سے مایوس ہونا کسی حقیقی بنیاد پر نہیں ہے۔ اس کا سبب زیادہ تر صرف ایک ہے، اور وہ ہے ضرورت سے زیادہ امید (over expectation)۔ حقیقت یہ ہے کہ حکومت کے عمل کی ایک حد ہوتی ہے۔ اس حد کے باہر حکومت غیر مؤثر ہو جاتی ہے۔ یہ معاملہ دراصل ففٹی ففٹی کا ہے۔ یعنی آدھی ذمے داری مصلحین کی ہے۔ ان کا کام یہ ہے کہ قوم کے اندر شعوری بیداری لائیں، اور بقیہ آدھا کام حکومت کا ہے، جو انتظام کو درست کرے۔ مثلاً مصلحین اگر صرف حقوق کے مطالبہ کی تحریک چلائیں، تو پورا سماج رائٹ کانشش (right conscious) ہو جائے گا، وہ ڈیوٹی کانشش (duty conscious) نہ رہے گا۔ ایسے سماج میں کوئی بھی حکومت عوام کو مطمئن نہیں کرسکتی۔

سوڈان کے سابق پرائم منسٹر امام الصادق المہدی (پیدائش 1935) نے ایک پیپر پڑھا۔ اس پیپر کا موضوع یہ تھا کہ مڈل ایسٹ میں امن کس طرح قائم کیا جائے۔ انہوں نے اس مسئلے کا جوحل بتایا، اس کی پہلی شرط ان کے نزدیک یہ تھی کہ مڈل ایسٹ میں موجودہ نزاع کا بنیادی سبب مقامی نہیں ہے،، وہ باہر سے امپورٹ کیا گیا ہے۔ بین اقوامی برادری، خاص طور پر، امریکا اور یورپ کو یہ اعتراف کرنا ہوگا کہ اس صورتِ حال کے پیدا کرنے میں ان کا حصہ ہے:

The basic causes of the present conflict in the Middle East are not home-made. They are imported from abroad. The international community, particularly the Euro-American community must recognize its share in creating this conflict.

یہ ایک غیر عملی مطالبہ ہے۔ اس قسم کا اعتراف خود مسلمان بھی نہیں کریں گے پھر دوسری قوموں سے اس کی امید کیسے کی جاسکتی ہے۔ سیاست دراصل ممکن کا آرٹ ہے، نہ کہ ناممکن کا کھیل۔

امریکا کے ڈاکٹر جوآنے ہک مین (Jo Anne Hickman) کی تقریر کا عنوان یہ تھا—

تعلیم کارول (The Role of Educaiton)۔انہوں نے اپنی تقریر میں دوسری باتوں کے ساتھ اس پر زور دیا کہ بچوں کی تعلیم میں سرپرستوں کی شمولیت (parental involvement) بے حد ضروری ہے۔انہوں نے کہا کہ میں خود ایک اسکول کا ٹیچر ہوں، اور میں نے اس سلسلے میں ایک تجربہ کیا ہے۔انہوں نے بتایا کہ ہم نے اپنے اسکول میں بچوں کے سرپرستوں کو بلایا، اورانہیں بعض مضامین کی عملی تربیت دی۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ سرپرست اپنے بچوں کو زیادہ بہتر طور پر تعلیمی مدد دینے کے قابل ہو گئے، اور بچوں کا رزلٹ پہلے سے بہتر رہا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک مفید تجویز ہے، اوراسکول کے علاوہ مدرسہ میں بھی اس کا تجربہ کیا جاسکتا ہے۔

نارتھ کوریا کے ڈاکٹر سی کنیتھ کائننس (C.Kenneth Quinones) نے ایک مفصل رپورٹ پیش کی۔ وہ نارتھ کوریا میں پیدا ہوئے ،مگر اب وہ واشنگٹن کے ایک ادارے سے منسلک ہیں۔ نارتھ کوریا اورامریکا کے درمیان نیوکلیر ہتھیار بنانے پر جونزاع ہے، اس پر انہوں نے ایک تفصیلی رپورٹ پیش کی۔ اپنی رپورٹ میں انہوں نے کہا کہ اس مسئلے کا حل اس طرح ہوسکتا ہے کہ دونوں پارٹیاں سمجھوتہ اوررعایت پر تیار ہوں:

This would require compromise and concessions on both sides.

یہ بات بظاہر معقول معلوم ہوتی ہے۔مگر تجربہ بتا تا ہے کہ وہ قابلِ عمل نہیں۔اس دنیا میں نزاع کا خاتمہ زیادہ تر یک طرفہ بنیاد پر ہوتا ہے۔دوطرفہ بنیاد پر نزاع کے خاتمے کی کوشش کرنے کا نتیجہ صرف یہ ہے کہ نزاع کبھی ختم ہی نہ ہو، اور تعمیر وترقی کا کام رُکا رہے۔

جاپان کے پروفیسر ماس اہساہیشی (Masahisa Hayashi) نے ایک پیپر پیش کیا جس کا موضوع یہ تھا— جزیرہ نما کوریا میں پیس کا قیام اوراس میں جاپان کارول:

The peace on the Korean peninsula and the Role of Japan.

جاپانی پروفیسر نے اس سلسلے میں کئی باتیں کہیں۔ایک بات یہ تھی کہ حقیقی دنیا میں انتخاب سب کچھ اور کچھ نہیں کے درمیان نہیں ہے، بلکہ مارجنل کاسٹ (marginal cost) اور مارجنل

فائدہ کے درمیان تقابل میں مسئلہ کا مؤثر حل پایا جاتا ہے:

The choice in the real world is not of the nature of all or nothing, but the comparision of marginal costs and marginal benefits is essential to achieve the efficient solution.

امریکا کے پال ایف چیمبرلن (paul F. Chamberlin) کے پیپر کا عنوان یہ تھا—

امریکا کے لیے ایک حقیقت پسندانہ پالیسی:

A realistic U.S Policey

جیسا کہ معلوم ہے، دوسری جنگ عظیم سے پہلے کوریا ایک واحد ملک تھا۔ اس کے بعد کوریا کو دو برابر حصوں میں 38 خط متوازی (38 parallels) پر بانٹ دیا گیا۔ نارتھ کوریا روس کے زیر انتظام رہا اور ساؤتھ کوریا امریکا کے زیر انتظام۔

نارتھ کوریا میں نیوکلیر ہتھیاروں کے سوا کوئی اور ترقی نہ ہوسکی۔ دوسری طرف ساؤتھ کوریا نے غیر محدود ترقی کی۔ اب کوشش ہورہی ہے کہ دونوں حصوں کو ایک کر دیا جائے۔ پیپر میں اس موضوع پر مختلف باتوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ بتایا گیا تھا کہ متحدہ کوریا بلاشبہ شمال مشرقی ایشیا کا تجارتی مرکز بن جائے گا:

Unified Korea will undoubtedly seek to become the commercial hub of Northeast Asia.

جو بات کوریا کے اتحاد کے بارے میں درست ہے، وہی انڈیا اور پاکستان کے اتحاد کے بارے میں بھی درست ہوسکتی ہے۔ مگر ضد کی سیاست نے ذہنوں کو اتنا زیادہ ماؤف کر دیا ہے کہ اب کوئی بھی اس پر سوچنے کے لیے تیار نہیں۔

فلپائن (Philippine) کے جوس ڈی وینیسیا (Josede venecia, Jr.) نے اپنی تقریر میں تفصیل سے بتایا کہ فلپائن کی حکومت کس طرح یہ کوشش کر رہی ہے کہ اقوام متحدہ اپنے نظام میں مستقل طور پر ایک انٹر ریلیجس کونسل قائم کرے۔ انہوں نے جو باتیں کہیں ان میں سے ایک بات یہ تھی کہ ہم یہ تجویز کرتے ہیں کہ یہ اعلان کیا جائے کہ اقوام متحدہ میں 2004 کا سال انٹرفیتھ

کونسل کا سال ہوگا۔

We propose that 2004 shall be declared as the year of the Interfaith Council in the UN.

کسی مقصد کے لیے سال منانا یا مہینہ اور ہفتہ منانا ایک پرانا طریقہ ہے۔ اب تک کے تجربے کے مطابق، یہ طریقہ مکمل طور پر ناکام ثابت ہوا ہے۔ ایسی حالت میں سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ کیوں ایک ناکام طریقے کو بار بار دہرانے کی بات کرتے ہیں۔

ایک صاحب نے گفتگو کے دوران کہا کہ تقابلی مذہب کا جامع مطالعہ اخلاقی اور روحانی قدروں کی یکسانیت کو بتائے گا۔ یہ اہلِ مذاہب کو اس قابل بنائے گا کہ وہ انسانی مسائل کے بارہ میں مشترک نقطۂ نظر اختیار کرسکیں:

A Comprehensive study of comparative Religion would reveal the essential universality of spiritual and ethical values, and could enable believers to spell out a common approach to the resolution of the problems of the Humanity.

میرے نزدیک مذاہب کے درمیان نہایت واضح فرق پائے جاتے ہیں۔ اس لیے اس معاملے میں صحیح فارمولا اختلاف کے باوجود اتحاد ہے، نہ کہ اختلاف کے بغیر اتحاد۔

ایک مسلم اسکالر نے مالک بن بنی کے حوالے سے کہا کہ یہ دراصل دورِ جدید میں مسلمانوں کا ذہنی جمود (intellectual stagnation) تھا جس نے نوآبادیاتی نظام (Colonization) کا راستہ ہموار کیا، اور اس طرح مشرقی قوموں پر مغربی قوموں کا غلبہ قائم ہوا۔ اسلامی نقطہ نظر سے زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ وہ معاملہ تھا، جس کو قرآن میں: وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (3:140) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ یعنی قانونِ فطرت کے تحت ایک قوم کا غلبہ ختم ہونا اور دوسری قوم کا غلبہ قائم ہونا۔

ایک صاحب نے گفتگو میں کہا کہ قرآن واضح طور پر دوسرے مذاہب کی حقانیت کا اعتراف کرتا ہے اور ہر مذہب کے ماننے والے کو مسلم بتاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام مذہبی تعدد کو ان

کے حق کے طور پر تسلیم کرتا ہے، نہ کہ محض عملی موافقت کے طور پر:

In fact Islam accepts religious plurality as a matter of right not mere convenience.

صحیح بات یہ ہے کہ اسلام کے سوا مذاہب جو دوسرے پیغمبروں سے منسوب ہیں، وہ اپنی ابتداء میں بلاشبہ یکساں طور پر برحق تھے۔ مگر اپنی موجودہ شکل میں وہ مستند مذہب کی حیثیت نہیں رکھتے۔ کیوں کہ بعد کے زمانہ میں ان میں تبدیلیاں ہوئیں، اور وہ اپنی اصل حالت پر باقی نہ رہے۔

ایک صاحب نے مذاہب کے باہمی بقا (Inter-Religious co-existence) پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اس کا مطلب ہے مذہبی تعدد کا باہمی اعتراف، مذہبی آزادی کا تحفظ، مذہبی رواداری، پرامن باہمی تعاون اور مذاہب کے درمیان صحت مند مسابقت:

This means mutual acceptance of religious plurality, protection of religious freedom. religious toleration and peaceful co-operation and competition between the faiths.

اس جملہ میں پہلی بات درست نہیں، یعنی مذہبی تعدد کا نظریہ۔ مذہبی تعدد کا مطلب یہ ہے کہ ہر مذہب یکساں طور پر سچا ہے۔ یہ بات بداہۃً ہی ناقابلِ قبول ہے۔ کیوں کہ مختلف مذاہب میں اتنا زیادہ فرق پایا جاتا ہے کہ ہر مذہب کو یکساں طور پر برحق سمجھنا سرے سے قابلِ عمل ہی نہیں۔

ایک عرب اسکالر نے گفتگو کے دوران ایران کا تذکرہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ انقلاب کے بعد ایران میں جو تشدد ہوا اس کی ذمہ داری مغربی قوموں پر ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ دراصل امریکا اور برطانیہ کے خلاف ایرانیوں کی ناراضگی تھی، جو 1979 کے اسلامی انقلاب کا سبب بنی۔ خاص طور پر 1953 کا واقعہ جب کہ امریکا کے خفیہ جاسوسی ادارہ سی آئی اے (CIA) کے ذریعے مصدق کی جمہوری حکومت کو زبردستی ختم کرکے شاہِ ایران کو دوبارہ اقتدار میں واپس لایا گیا:

It was Iranian resentment against Britain and America that resulted in the islamic revolution of 1979 in iran.

میں نے کہا کہ اگر آپ کا تجزیہ درست مان لیا جائے تو اس کے مطابق ایران کے انقلاب کو قومی انقلاب کہنا صحیح ہوگا، نہ کہ اسلامی انقلاب۔

ایک تعلیم یافتہ عرب نے کہا کہ وہ مسائل جو دنیا کو تقسیم کرتے ہیں، اگر وہ غیر حل شدہ باقی رہیں، تو ایک طرف دولت مند ملک تباہ کن ہتھیار جمع کریں گے، اور دوسری طرف غریب ملکوں میں وہ چیز پیدا ہوگئی، جس کو دہشت گردی کہا جاتا ہے:

If the problems which divide the world remain unresolved. then while the haves of the world would be armed with weapons of mass destruction. the have not would resort to massive spoling and obstruction, namely, terrorism.

لکھنے اور بولنے والے طبقہ کی یہی باتیں ہیں جو دہشت گردی کے لیے جواز فراہم کرتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسائل ہمیشہ دنیا میں موجود رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں لوگوں کو بتانا چاہیے کہ تمہارے مسئلہ کا حل پرامن تعمیر واستحکام میں ہے۔ تشدد کا طریقہ صرف مسائل میں اضافہ کرنے والا ہے، نہ کہ مسائل کو حل کرنے والا۔

ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان نے گفتگو کے دوران کہا کہ برصغیر ہند کے سرجیکل آپریشن (surgical Operation) کا نتیجہ یہ ہوا کہ انڈیا اور پاکستان دو حریف ملک وجود میں آگئے۔ دونوں کے درمیان نصف صدی سے بھی زیادہ مدت سے ٹکراؤ کی سیاست جاری ہے۔ اس کا فائدہ نہ پاکستانی مسلمانوں کو ہوا، اور نہ ہندوستانی مسلمانوں کو۔ یہ بتاتے ہوئے انہوں نے کہا— میں نہیں سمجھتا کہ بانیان پاکستان کے ذہن میں یہ چیز موجود تھی:

I do not think this is what the founding fathers had in their mind.

میں نے کہا کہ اجتماعی معاملات میں انتہا پسندانہ اقدام بے حد خطرناک کام ہے۔ اس طرح کے معاملہ میں اقدام صرف صاحبِ بصیرت رہنماؤں کو کرنا چاہیے، جو مستقبل بینی کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ جن لوگوں کے اندر یہ صلاحیت نہ ہو، انہیں چاہیے کہ وہ صرف انفرادی زندگی گزاریں۔ ایسے لوگوں کے لیے اجتماعی قیادت میں داخل ہونا درست نہیں۔ ایک مسلم ملک کے ایک سیاسی لیڈر نے کہا کہ ہمارے خارجہ تعلقات اس بنیاد پر قائم نہیں کیے جا سکتے، جو اکثر قدیم فقہا نے وضع کی تھی۔ انہوں نے دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کیا تھا— اسلامی ملک اور دشمن ملک:

Our foreign relations will not be on the basis of that formulated by many ancient Muslim jurists considering the world in terms of two camps, the islamic and the enemy.

موجودہ مسلمان جن فکری مسائل سے دو چار ہیں ان میں غالباً سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے۔ قدیم فقہا کا ساری دنیا کو دارالاسلام اور دارالحرب میں تقسیم کرنا ایک غیر اسلامی فعل تھا۔ اس نظریے نے تمام مسلمانوں، خاص کر علما کے ذہن کو غیر حقیقت پسند بنا دیا۔ غیر مسلم دنیا کے بارے میں وہ مثبت سوچ سے محروم ہو گئے۔ میرے نزدیک ساری دنیا دارالانسان ہے۔ اگر اس کو عقیدے کے اعتبار سے تقسیم کیا جائے تو اس کو دارالاسلام اور دارالدعوہ کہا جا سکتا ہے، نہ کہ دارالاسلام اور دارالحرب۔

فلپائن کی حکومت کے نمائندہ جوس ڈی وینیسیا (Jose de venecia) نے پر اعتماد لہجے میں بتایا کہ وہ صدر امریکا جارج بش سے ملے اور ان کے سامنے اپنی یہ تجویز رکھی کہ اقوام متحدہ کے ایک آرگن کے طور پر ان میں انٹر ریلیجس کونسل قائم کی جائے۔ جارج بش نے اس سے اتفاق کیا اور انہوں نے نیشنل سیکورٹی ایڈوائزر کو ہدایت دی کہ وہ اس معاملے میں ہمارا تعاون کرے۔

I am happy to report to you that when president Arroyo and I mentioned this to President Bush, he welcomed this positively and directed Condoleezza Rice, the National security Adviser to cooordinate with us in promithing this peace initiative.

لوگ حکومت کے ذمہ داروں سے ملتے ہیں، اور خوشی کے ساتھ دنیا کو یہ خبر دیتے ہیں کہ انہوں نے ہماری تجویز کو پسند کیا۔ مگر اعلیٰ سطح کی ملاقاتوں کے باوجود نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلتا۔ میں ذاتی طور پر کام کے اس طریقے کو سراسر بے فائدہ سمجھتا ہوں۔ جس آدمی کے دل میں کسی کام کا درد پیدا ہوا اس کو چاہیے کہ وہ خود اپنے ممکن دائرے میں اس پر عمل شروع کر دے۔ اس طرح کے معاملے میں بڑے بڑے لوگوں سے ملنا میڈیا آئیٹم بنانے کا ذریعہ ہو سکتا ہے، مگر وہ مقصد کی تکمیل میں معاون نہیں۔

آئی آئی ایف ڈبلیو پی (IIFWP) کے چیرمین ڈاکٹر چنگ ہان کاک (Chung Hwan Kwak) نے کانفرنس کے افتتاح کے موقع پر کی نوٹ ایڈرس (Keynote Address) پڑھا۔ انہوں نے جدید تبدیلیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اخلاقی اور روحانی شخصیتیں

سیاسی اور فوجی شخصیتوں سے زیادہ اہم حیثیت حاصل کر رہی ہیں:

Moral and spiritual authority, to some extent, are becoming more important than political and milirary authority.

یہ مبالغہ نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔ قدیم زمانے میں سیاسی اقتدار ہی سب کچھ سمجھا جاتا تھا۔ موجودہ زمانہ اداروں (institutions) کا زمانہ ہے۔ جدید حالات نے اس بات کو ممکن بنا دیا ہے کہ مختلف اجتماعی مقاصد کے تحت بڑے بڑے ادارے قائم کیے جائیں۔ ان اداروں کے اثرات اتنے زیادہ ہمہ گیر ہیں کہ اب ان کے مقابلے میں حکومتی اقتدار ثانوی اہمیت کی چیز بن گیا ہے۔ اب سیاسی اقتدار کے بغیر سارے مقاصد حاصل کیے جاسکتے ہیں، حتیٰ کہ خود سیاسی اقتدار کو بھی بڑے پیمانہ پر متاثر کیا جاسکتا ہے۔

15 اگست 2003 کو کانفرنس کا آخری دن تھا۔ اختتامی اجلاس سول شہر سے 20 کیلومیٹر دور ایک اسکول لٹل اینجلس (Little Angels) میں رکھا گیا تھا۔ تمام شرکا بذریعہ روڈ سول سے لٹل اینجلس لے جائے گئے۔ وہاں اسکول کے وسیع ہال میں کچھ تقریریں ہوئیں۔ سب سے لمبی تقریر ریورنٹ مون کی تھی۔ تقریروں کے بعد کلچرل شو کا پروگرام ہوا جو تالیوں کی گونج میں ایک گھنٹے سے زیادہ دیر تک چلتا رہا۔ مجھے ذاتی طور پر کلچرل شو سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ تاہم ہال کے دوسرے حاضرین کافی دلچسپی کے ساتھ دیکھتے رہے، اور ان کے پرشوق تقاضوں کی وجہ سے یہ کلچرل شو مقررہ وقت سے زیادہ دیر تک چلتا رہا۔ شام کا کھانا اسی اسکول کے اندر کھایا گیا۔

16 اگست 2003 کو واپسی تھی۔ صبح 6 بجے ہم لوگوں نے ہوٹل چھوڑ دیا، اور بذریعہ روڈ روانہ ہو کر سول ایرپورٹ پہنچے۔ کئی لوگ ساتھ تھے اس لیے مجھے خود کچھ کرنا نہیں پڑا۔ ایرپورٹ کے مراحل طے کرنے کے بعد دوبارہ تھائی ایرلائن سے دہلی کے لیے روانگی ہوئی۔ یہ جہاز سول ایرپورٹ سے مقامی وقت کے مطابق صبح ساڑھے نو بجے روانہ ہوا۔

سفر سے واپسی میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ بینکاک میں جب جہاز لینڈ کرنے کے لیے نیچے اتر رہا تھا تو ڈاکٹر اوصاف علی کو ناک سے خون آنے لگا۔ پریشر کی وجہ سے ایسا ہوا۔ خون اتنا گرا

کہ ان کی قمیص لال ہوگئی۔ یہ منظر دیکھ کر میں گھبرا گیا۔ مگر ڈاکٹر اوصاف علی صاحب حیرت انگیز طور پر بالکل مطمئن دکھائی دے رہے تھے۔ وہ بالکل نارمل انداز سے بات کرتے رہے۔ انہوں نے اطمینان کے ساتھ کہا کہ کوئی پریشانی کی بات نہیں۔ چند دن کے اندر جسم کے خود کار نظام کے تحت خون کی یہ کمی پوری ہوجائے گی۔ دہلی ایرپورٹ پر اتر کر وہ اطمینان کے ساتھ اپنی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہوگئے۔

اس غیر معمولی تجربہ پر میں غور کرتا رہا۔ آخر کار میری سمجھ میں آیا کہ اضطراب اور اطمینان دونوں اصلاً دماغی حالتیں ہیں۔ تکلیف بظاہر آدمی کے جسم پر ہوتی ہے مگر اس پر نفسیاتی کیفیت کو انسان کا دماغ کنٹرول کرتا ہے۔ اگر آدمی کے اعصاب مضبوط ہوں، تو ظاہری تکلیف کے باوجود پوری طرح مطمئن رہ سکتا ہے، اور اگر اعصاب کمزور ہوں تو ہر تکلیف پر وہ بے چین ہوجائے گا جتنی کہ چھوٹی اور معمولی تکلیف پر بھی۔ اصل یہ ہے کہ کوئی پریشانی صرف اس وقت تک پریشانی رہتی ہے جب تک آپ کے پاس اس کی توجیہہ (explanation) نہ ہو۔ توجیہہ کرنے کے بعد پریشانی یا ذہنی تناؤ فوراً ختم ہوجاتا ہے۔

سول سے روانہ ہوکر ہمارا جہاز ہانگ کانگ (Hong Kong) کے ایرپورٹ پر اترا۔ ہانگ کانگ ایرپورٹ بینکاک ایرپورٹ جیسا شاندار نظر نہیں آیا۔ ہانک کانگ ایرپورٹ پر اتفاق سے دو مسلم تاجروں سے ملاقات ہوئی۔ ان میں سے ایک پاکستان سے تعلق رکھتے تھے، اور دوسرے بنگلہ دیش سے۔ دونوں سے دیر تک گفتگو ہوئی۔ میں نے سوچا کہ ہانگ کانگ میں یہ دونوں خوشی کے ساتھ مل رہے ہیں، مگر ''مشرقی پاکستان'' میں دونوں ایک ساتھ رہنے پر راضی نہ ہوسکے۔

ہانگ کانگ چین کے جنوبی ساحل پر واقع ہے۔ یہ کئی جزیروں کا مجموعہ ہے۔ وہ سابق پرتگالی مقبوضہ مکاؤ (Macau) سے 40 میل دور ہے۔ ہانگ کانگ کا کل رقبہ 1062 مربع کلومیٹر ہے۔ ہانگ کانگ کی بندرگاہ بہترین قدرتی بندرگاہ (Harbour) سمجھی جاتی ہے۔ ہانگ کانگ کا علاقہ زیادہ تر پہاڑوں پر مشتمل ہے۔ یہاں کی سب سے بلند چوٹی (Taj Moshan) کی اونچائی 957 میٹر (1403 فٹ) ہے۔

ہانگ کانگ میں لمبی مدت سے جنگلوں کی کٹائی ہوتی رہی ہے۔ اب یہاں کی زمین کے صرف 13 فیصد حصے پر جنگلات باقی ہیں۔ تاہم اب جنگلات کی کٹائی کے خلاف سخت قوانین بنائے گئے ہیں، اور دوبارہ جنگل اگاؤ (reafforestation) کی مہم تیزی کے ساتھ چلائی جارہی ہے۔ پہلے ہانگ کانگ میں شیر، وغیرہ پائے جاتے تھے، مگر اب یہاں اس قسم کے جانوروں کا خاتمہ ہوگیا ہے۔

یہاں کثرت سے ایسے مکانات ہیں جن کے بیسمنٹ میں شاپنگ سنٹر ہیں، اور اوپر رہائشی فلیٹ۔

برطانی استعمار کے زمانہ میں انگریزوں نے ہانگ کانگ کو پٹہ (lease) پر ننانوے سال کے لیے لیا تھا۔ پٹہ کی یہ مدت 1997 میں ختم ہو رہی تھی۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد جب برطانی ایمپائر کمزور ہوا، تو چین نے ہانگ کانگ کی واپسی کا مطالبہ شروع کر دیا۔ مگر چین نے اپنے آپ کو گفت وشنید کی حد تک محدود رکھا۔ اس نے کبھی اس معاملہ میں یہ پروگرام نہیں بنایا کہ وہ ہانگ کانگ میں اپنی فوجیں داخل کر کے اس پر قبضہ کرلے۔ اگرچہ ہانگ کانگ کا جزیرہ چین سے ملا ہوا ہے۔ برطانی حکومت سے چین کی یہ گفت وشنید جاری رہی۔ یہاں تک کہ 1997 میں جب پٹہ کی مدت پوری ہوئی تو ہانگ کانگ سے برطانیہ کا اقتدار بھی ختم ہو گیا۔ ہانگ کانگ اب چین کے باقاعدہ قبضے میں ہے۔

اس کے برعکس مثال مصر کی ہے۔ نہر سویز کو بھی برطانی اور فرانسیسی کمپنیوں نے مصر سے پٹہ پر لیا تھا۔ پٹہ کے معاہدہ کے مطابق نہر سویز پر کمپنی کا کنٹرول 99 سال تک رہنا تھا۔ اس مدت کو 1968 میں ختم ہونا تھا۔ مگر مصر کے سابق صدر جمال عبدالناصر نے اس مدت کے خاتمے کا انتظار نہیں کیا، بلکہ 29 اکتوبر 1956 کو یک طرفہ طور پر پٹہ کے خاتمے کا اعلان کر دیا، اور نہر سوئز پر اپنا پیشگی قبضہ قائم کرلیا۔ جس وقت جمال عبدالناصر نے یہ کام کیا اس وقت تمام عرب رہنماؤں نے براہ راست یا بالواسطہ طور پر اس کی تائید کی۔ عرب کے باہر مسلم رہنماؤں نے بھی اس پر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ مگر یہ انتہائی غیر دانش مندانہ اقدام تھا۔ اس کے بعد برطانیہ اور فرانس نے اسرائیل کی مدد کی۔ چنانچہ اسرائیل نے مصر کے اوپر اچانک حملہ کر کے مصر کی فوجی طاقت کو تباہ کر دیا اور مزید علاقوں پر قبضہ

کر کے ریاست اسرائیل کے رقبہ کو پانچ گنا بڑھا لیا۔

مصر کے سابق صدر جمال عبدالناصر کا یہ اقدام بلا شبہ احمقانہ حد تک غلط تھا۔ مگر میرے نزدیک تمام عرب اور غیر عرب رہنما اور دانشور اس غلطی میں یکساں طور پر شریک ہیں۔ یہ ہمارے رہنماؤں کی جذباتی سیاست تھی، جس نے جمال عبدالناصر کو اس تباہ کن چھلانگ کا حوصلہ دیا۔ اگر ہمارے علما اور دانشوروں نے امت کے اندر حقیقت پسندانہ سیاست کا ماحول بنایا ہوتا، تو جمال عبدالناصر کو کبھی ایسے احمقانہ اقدام کی جرات نہ ہوتی۔ ہانگ کانگ سے روانہ ہو کر ہمارا جہاز دہلی کے ہوائی اڈے پر اترا۔ رات کے تقریباً دس بجے کا وقت ہو چکا تھا۔ ایر پورٹ پر کوئی مسئلہ پیش نہ آیا۔ باہر نکلے تو یہاں مسٹر خالد انصاری، مسٹر رجت ملہوترہ اپنے دو اور ساتھیوں کے ہمراہ موجود تھے۔ ان کے ساتھ روانہ ہو کر گھر واپس پہنچا۔